Regd. L. No. 7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

دسمبر 1974

اِس پرچہ میں

مرزائیت کے نقشِ قدم پر ایک اور تحریک

آئندہ پرچہ میں

جنسیات کا اثر — قوموں کے عروج و زوال پر

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ - پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون	بدلِ اشتراک
(۱½)	۸۰۸۰۰	پاکستان
ڈیڑھ روپیہ	خط و کتابت	سالانہ ــــــ پندرہ روپے
	ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور	غیر ممالک
		سالانہ ــــــ ڈیڑھ پونڈ

نمبر (۱۲)	دسمبر ۱۹۷۲ء	جلد (۲۷)

فہرست

(۱) لمعات ــــــــــــــــ ۲
(۲) قراردادیں طلوعِ اسلام کنونشن ــــــــــــ ۸
(۳) اصل مقصود کیا ہے؟ ــ فرد یا مملکت ــــ (محترم پرویز صاحب) ــــــ ۹
(۴) مرزائیت کے نقشِ قدم پر ــ لیکن اس سے کہیں زیادہ خطرناک ــــ (محترم محمد اسلام صاحب) ــــــ ۳۳
(۵) روئیداد طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۲ء ــ (چوہدری عبدالعزیز ایم اے) ــ ۵۲

ایڈیٹر محمد خلیل ۔ ناشر سراج الحق ۔ مقام اشاعت ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲، لاہور ۔ پرنٹر محمد محسن ۔ مطبوعہ لاہور آرٹ پریس ۔ انار کلی ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

ہم شروع سے کہتے چلے آرہے ہیں کہ

(۱) اس مملکت کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا اور اس کا مقصد یہ بتایا گیا کہ یہاں اسلامی نظام قائم اور اسلامی معاشرہ متشکل کیا جائے گا۔

(۲) اس دعوے کے پیشِ نظر اس مملکت کا نام "اسلامی جمہوریہ" رکھا گیا۔ دستور میں یہاں تک کہہ دیا گیا کہ مملکت کا مذہب اسلام ہوگا۔ یہ بھی کہ یہاں کوئی قانون اسلام کے خلاف نہ وضع کیا جائے گا نہ رائج۔

لیکن اس کے باوجود یہاں، نہ اربابِ اقتدار کا ذہن اس باب میں صاف ہے کہ اسلام کے تقاضے کیا ہیں اور اسلامی نظام کہتے کسے ہیں اور نہ ہی مذہبی راہنماؤں کا اندازِ نگاہ اسلامی ہے۔ حتیٰ کہ ان میں یہ سمجھنے کی بھی صلاحیت نہیں کہ اسلامی نظام ہوتا کیا ہے۔

ان دونوں کی نگاہ غیر اسلامی ہے اور اندازِ فکر سیکولر۔ ہمارے اس دعویٰ پر بہت سے ذہنوں میں اختلاف کی لہریں ابھریں گی بالخصوص مذہب پرست طبقہ کے ذہن میں۔ ہم اپنے دعویٰ کی تائید میں دو ایک مثالیں پیش کرتے ہیں اور پھر ان اختلافی احساس رکھنے والے حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ہمارا دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے یا تعصب پر؟

"احمدیوں" کے متعلق حالیہ فیصلہ کا اعلان کرتے ہوئے محترم وزیر اعظم نے فرمایا تھا کہ ہم نے یہ مطالبہ عوام (یعنی ملک کی اکثریت) کی خواہش کے مطابق کیا ہے۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ ہم نے یہ فیصلہ اس لئے کیا ہے کہ یہ اسلام کا مطالبہ تھا۔ کہا یہ کہ یہ فیصلہ اس لئے کیا ہے کہ ملک کی اکثریت ایسا چاہتی تھی۔ (انہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ یہ فیصلہ مذہبی بھی ہے اور سیکولر بھی)۔ یعنی یہ فیصلہ "اسلامی سوشلزم" کی طرح "مذہبی سیکولرازم" پر مبنی ہے!) اس سے واضح ہے کہ اگر یہاں کی آبادی کی اکثریت "احمدی" افراد پر مشتمل ہوتی تو فیصلہ ان کے حق میں کیا جاتا۔ بالفاظِ دیگر، یہاں فیصلوں کا مدار و معیار اکثریت کی خواہشات اور آراء ہیں۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں ملک کے اربابِ دانش و بینش سے کہ اسے "سیکولر جمہوریت" نہیں کہتے تو اور کیا کہتے ہیں؟

اب آیئے اربابِ مذہب کی طرف۔ انہوں نے شروع سے مملکت کے قوانین کو پرسنل (شخصی) لاز

اور پبلک (ملکی) لاز میں تقسیم کر رکھا ہے۔ پرسنل لاز ہر فرقہ کی اپنی اپنی فقہ کے مطابق ہوں گے اور پبلک لاز مملکت کے وضع کردہ۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں ارباب فکر و دانش سے کہ کیا یہ تقسیم سیکولر نظامِ سیاست کی وضع کردہ اور سیکولر حکومتوں میں رائج ہے یا نہیں؟ اور ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں ارباب مذہب سے کہ کیا عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں (جب اسلامی نظام قائم تھا) پرسنل اور پبلک لاز میں یہ تفریق و تمیز موجود تھی؟ کیا یہ مسلمانوں کے دورِ ملوکیت میں وضع نہیں ہوئی جب نظامِ حکومت سیکولر تھا۔ یعنی جب مذہبی امور اور دنیاوی امور میں ثنویت کا نظریہ رائج اور نافذ کیا گیا تھا۔

اب آیئے پبلک لاز کی طرف۔ بیس پچیس سال تک یہ لوگ ڈھنڈورا پیٹتے رہے کہ ملک کا کوئی قانون "کتاب و سنت" کے خلاف نہیں ہوگا اور اس کے بعد مودودی صاحب نے (جنہیں ان کے معتقدین امام احمد بن حنبلؒ کے ہم پایہ، امام ابن تیمیہؒ کے ہمدوش اور (معاذ اللہ) اللہ کا ساشاہکار قرار دیتے ہیں) فرمایا کہ

> پاکستان کی آبادی کی اکثریت چونکہ حنفی المسلک ہے اس لئے مملکت کے پبلک لاز فقہ حنفی پر مشتمل ہوں گے۔

وہی "اکثریت" کا اصول جو سیکولر نظام کی اصل و اساس ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ چونکہ (ان کے نزدیک) فقہ حنفی اسلامی ہے اس لئے اسے ملک کا قانون قرار دیا جائے، کہا یہ ہے کہ چونکہ یہاں کی "اکثریت" حنفی المسلک ہے اس لئے ان کی فقہ کو ملک میں رائج کر دیا جائے۔ کیا یہ دلیل وہی نہیں جسے سیکولرازم اپنے نظریہ کی حمایت میں پیش کرتا ہے۔ مودودی صاحب نے اپنے نظریہ کی مزید وضاحت یہ کہہ کر کر دی۔

> عام ملکی قانون بہرحال کتاب و سنت کی اسی تعبیر پر مبنی ہوگا جسے اکثریت مانتی ہے مراکو میں اکثریت مالکیوں کی ہے اس لئے وہاں کا پبلک لا مالکی طرز پر بنے گا۔ انڈونیشیا اور ملائشیا میں اکثریت شافعی ہے اس لئے وہاں کا پبلک لا شافعی تعبیر پر بنے گا۔ ایران میں اکثریت شیعہ ہے اس لئے وہاں پبلک لا شیعہ تعبیر پر بنے گا۔
>
> (ایشیا۔ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

ہمارا مقصد یہ کسی فقہ کی تائید ہے نہ تنقیص۔ ہمارے نزدیک فقہ کسی خاص دور میں رائج قوانین کا نام ہے جو نہ دائمی اور غیر متبدل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی لازماً اسلامی۔ اسلامی سے ہماری مراد ہے کتاب اللہ کے مطابق ــــ ہمارا موقف یہ ہے کہ ہر دور کی اسلامی مملکت کتاب اللہ کی حدود کے رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قوانین خود مرتب کرنے کی مجاز ہوتی ہے۔ انہی قوانین کو فقہ کہا جائے گا جسے عند الضرورت وہی مملکت یا کوئی آنے والی مملکت اپنی صوابدید کے مطابق تبدیل بھی کر سکتی ہے اور منسوخ بھی ــــ ناقابلِ تغیر و تبدل .... قرآنی احکام و اصول ہوں گے۔ ہم اس مقام پر جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ان حضرات کے تصور کی رو سے اسلام میں صحیح اور غلط، اسلامی اور غیر اسلامی کے لئے کوئی مستقل، غیر متبدل معیار نہیں۔ معیار "اکثریت" ہے۔ جو کچھ اکثریت کے نظریہ اور مسلک کے مطابق ہو وہ قابلِ قبول (اور صحیح) اور اقلیت کا نظریہ اور مسلک غلط اور ناقابلِ قبول۔ کیونکہ ان کی تعداد کم ہے۔

فرمائیے! اس اصول کو سیکولرازم کہا جائے گا یا اسلامی؟ اسلامی تصورِ حیات و نظامِ زندگی میں تعداد کی کثرت و قلت کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس میں معیارِ حق و باطل اور مدارِ اسلامی و غیر اسلامی مستقل بالذات اور غیر متبدل ہے۔ اس میں حق، حق ہے خواہ اس کی تائید میں ایک ہاتھ بھی نہ اٹھے اور باطل باطل خواہ اس کی حمایت دنیا کی ساری آبادی کرنے لگ جائے۔ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ (۲۳/۷۱) "اگر حق لوگوں کی خواہشات اور خیالات کا اتباع کرنے لگ جائے تو کائنات میں سب تہس نہس ہو جائے۔" اسلامی تصورِ حیات اور سیکولرازم میں یہی بنیادی فرق ہے۔ سیکولرازم عوام کی خواہشات اور آراء کے تابع رہتا ہے۔ اسلام میں اتباع حق کا ہوتا ہے، خواہ اکثریت کچھ ہی کیوں نہ کہے۔

اب آئیے اصل سوال کی طرف جس کے لئے یہ تمہید ضروری سمجھی گئی۔ حال ہی میں مرکزی حکومتِ پاکستان کی کابینہ میں جو رد و بدل ہوا ہے اس میں ایک نئے قلمدانِ وزارت کا اضافہ کیا گیا ہے جس کا نام ہے۔ وزارتِ امورِ مذہبیہ۔ (MINISTRY FOR RELEGIOUS AFFAIRS) ۔ یہ خالصتہً سیکولر نظامِ حکومت کا تقاضا ہے اور اسلامی نظام کے یکسر خلاف۔ دنیاوی اور مذہبی امور میں تفریق و تقسیم وہ ثنویت (DUALISM) ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا اور جسے عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں رائج نظام نے عملاً مٹا کر دکھا دیا تھا۔ آپ کو اس عہد میں "امورِ مذہبیہ" کے لئے کوئی جداگانہ شعبہ دکھائی نہیں دے گا۔ اسلامی تصور کی رو سے ساری کی ساری مملکت اسلامی، فلہٰذا (دورِ حاضر کی اصطلاح کی رو سے) "مذہبی امور" سے متعلق ہوتی ہے۔ اس میں چونکہ جملہ امورِ مملکت اسلامی اصول و اقدار کی رو سے طے پاتے ہیں اس لئے اس میں ہر دنیاوی معاملہ دینی (دورِ حاضر کی اصطلاح میں مذہبی) ہوتا ہے۔ اس میں جنگ بھی مذہبی ہوتی ہے۔ صلح بھی مذہبی۔ (واضح رہے کہ ہم محض سمجھانے کی غرض سے "دینی" کی جگہ "مذہبی" لکھ رہے ہیں ورنہ اصل لفظ دینی ہی ہے) اس میں تجارت بھی مذہبی ہوتی ہے اور اقتصادیات بھی مذہبی۔ اس میں امورِ داخلہ بھی مذہبی ہوتے ہیں اور امورِ خارجیہ بھی مذہبی۔ اس میں جس طرح نماز کا اجتماع مذہبی ہوتا ہے اسی طرح پارلیمان کا اجلاس بھی مذہبی۔ المختصر اس میں، اقبالؔ کے الفاظ میں ہوتا یہ ہے کہ

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

دین کی چابی سے دنیا کا ہر دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس سیکولر نظام میں چونکہ دنیاوی امور اور مذہبی امور میں دوئی ہوتی ہے اس لئے اس میں جہاں دنیاوی امور کے لئے مختلف وزارتیں قائم ہوتی ہیں، ایک وزارت امورِ مذہبیہ کے لئے بھی قائم کر دی جاتی ہے۔ (انگریزی عملداری میں مرکزی حکومت میں ایک جداگانہ محکمہ ہوتا تھا جس کا تعلق کلیسا کے مذہبی امور سے ہوتا تھا)۔ (ECCLESIASTICAL DEPARTMENT) اسلامی نظام میں اور تو اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ بھی جداگانہ "مذہبی امور" نہیں ہوتے۔ یہ بھی اس نظامِ ملک کے مختلف عناصر ہوتے ہیں۔ اس میں (PUBLIC TREASURY) کو بیت المال کہا جاتا ہے اور جملہ محاصلِ حکومت کو جن سے وہ نظام افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشو و نما مہیا کرتا ہے، زکوٰۃ کہہ کر پکارا جاتا ہے اس میں مسجد کی حیثیت محض "پرستش گاہ" کی نہیں ہوتی۔ امورِ دنیا پر دین کی روشنی میں غور و فکر کے لئے مرکزِ مشاورت کی ہوتی ہے۔ اس

میں "حج" "الگ مذہبی فریضہ" نہیں ہوتا، ملتِ اسلامیہ کا عالمگیر اجتماع ہوتا ہے جس میں اجتماعی امورِ حیات پر دین کے اصولوں کی روشنی میں فکر و تدبر کیا جاتا ہے۔ مختصراً اسلامی مملکت میں نہ مذہبی امور دنیاوی امور سے الگ ہوتے ہیں نہ ان امور کے لئے جداگانہ وزارت کی تشکیل کی جاتی ہے۔

لیکن یہاں عجیب تماشا ہو رہا ہے۔ مملکت کا نام "جمہوریہ اسلامیہ" ہے۔ مملکت کا مذہب اسلام بتایا جاتا ہے۔ دستور میں یہ شق موجود ہے کہ مملکت اپنے جملہ اختیارات و مقتدرات خدا کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کرے گی اور کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نافذ نہیں ہوگا۔ اور اس کے باوجود یہاں "امورِ مذہبیہ" کے لئے ایک جداگانہ وزارت قائم کر دی جاتی ہے۔ ہم اربابِ اقتدار سے باادب پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب (دستور کی رو سے) اسلام ہماری مملکت کا مذہب ہے تو پھر اس (مملکت) میں سے ایک گوشہ الگ تراش کر اسے "وزارتِ امورِ مذہبیہ" قرار دے دینا کس طرح قابلِ فہم قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا اس وزارت کے علاوہ باقی وزارتوں میں جو امور طے پائیں گے۔ ان کا مملکت کے مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوگا؟ اگر ان حضرات کے لئے دین کے حوالے سے اس نکتہ کا سمجھنا مشکل ہے تو کم از کم یہ بات ان کی سمجھ میں ضرور آ جانی چاہیئے کہ کیا سوشلسٹ ممالک میں "سوشلزم" سے متعلق امور کے لئے کوئی "الگ وزارت" ہوتی ہے؟ جو مملکت کسی نظریہ پر مبنی ہو اس میں وہ نظریہ جملہ امورِ مملکت میں اس طرح رواں دواں ہوتا ہے جس طرح انسانی جسم میں خون زندگی۔ اگر جسم میں خون کو کسی الگ مقام میں محدود کر دیا جائے تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت اسلامی مملکت میں مذہب (یعنی دین) کی ہوتی ہے۔ وہ مملکت کے جملہ کاروبار میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔ اسی سے اس مملکت کی زندگی وابستہ ہوتی ہے۔ اگر وہ مملکت کے جملہ کاروبار میں محلول نہ ہو تو مملکت اسلامی نہیں رہ سکتی۔

یہ تو ہوئی اربابِ اقتدار کی بات۔ اب حاملینِ مذہب کی طرف آیئے۔

حکومت نے امورِ مذہبیہ سے متعلق ایک وزارت متشکل کر دی اور ایک "عالمِ دین" نے نہایت فخر و مسرت سے اس کا قلمدان سنبھال لیا۔ ان کی "اسلامی فکر" نے بھی انہیں یہ نہ بتایا کہ اسلامی مملکت میں اس وزارت کا وجود ہی غیر اسلامی ہے۔

اور نہ ہی ملک کے مذہبی گوشوں میں سے، کہیں سے بھی (تا دمِ تحریر) اس کے خلاف کوئی آواز بلند ہوئی۔ ان کی طرف سے اس کی توقع ہی عبث تھی۔ ان کا اسلام کا تصور یکسر "مذہبی" ہوتا ہے۔ دین نے تو انہیں چھوا تک بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا حکومت کے اس اقدام سے اختلاف تو ایک طرف، یہ اس سے بے حد خوش ہوتے ہوں گے کہ انہیں پھر سے ان کا وہ کھویا ہوا مقام مل گیا جو انہیں دورِ ملوکیت میں حاصل تھا۔ اب ان میں سے کوئی "شیخ الاسلام" ہوگا کوئی مفتیِ اعظم، کوئی قاضی القضاۃ! اب ان کی تحویل میں دیئے گئے امور (مذہبیہ) میں مملکت بھی دخیل نہیں ہو سکے گی۔ اب یہ مملکت کے اندر پھر سے اپنی الگ مملکت قائم کر سکیں گے۔ انہوں نے روم کے اندر ویٹیکن کی طرح ڈال دی ہے جکومت نے "قادیانی مسئلہ کا (مذہبی پیشوائیت کے بجائے) خود حل کر کے اسے (یعنی مذہبی پیشوائیت کو) جو زک پہنچائی تھی، اس نے (مذہبی پیشوائیت نے) اس کا

بہت جلد بدلہ لے لیا۔ اُس فیصلہ سے مملکت نے ایک قدم اسلامی نصب العین کی طرف اٹھایا تھا، انہوں نے (مذہب کو مملکت سے الگ کر کے) اسے پھر سے اُسی مقام پر پہنچا دیا جہاں سے مسلمانوں میں ملوکیت نے سر اٹھایا تھا۔ اب اقبالؒ کی روح یہ کہہ کر چیختی ہے تو چیختی رہے کہ

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

اور قائدِ اعظمؒ یہ کہتے ہوئے پکارتے ہیں تو پکارتے رہیں کہ

کچھ بھی ہو پاکستان میں تھیاکریسی کبھی قائم نہیں ہو سکے گی

یہاں تھیاکریسی نے اپنی پہلی اینٹ رکھ دی ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

اسلامی نقطۂ نگاہ سے قطع نظر، مملکت کا یہ اقدام خود مملکت کے لئے بھی خوش آیند ثابت نہیں ہوگا۔ تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ جب اور جہاں بھی مملکت میں مذہبی پیشوائیت کو اقتدار حاصل ہوا، مملکت ایک لمحہ کے لئے بھی چین کی نیند نہیں سو سکی۔ پاکستان کے تو مطالبہ کا بنیادی مقصد ہی یہ تھا کہ اس میں اسلامی نظام قائم کر کے مذہبی پیشوائیت سے پیچھا چھڑایا جائے۔ ہم اربابِ حکومت پر واضح کر دینا اپنا ملّی فریضہ سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ اقدام جو آج اس قدر معصوم اور بے ضرر سا نظر آتا ہے، کل کو خود ان کے لئے بھی وبالِ جان بن جائے گا۔

ہم ملک کے اربابِ دانش سے پوچھتے ہیں کہ کیا اس کے بعد بھی آپ اس سے متفق نہیں ہوں گے کہ اربابِ اقتدار ہوں یا مذہبی پیشوائیت، یہاں سب کا انداز فکر و نظر سیکولر ہے۔ اسلامی نگاہ کسی کی بھی نہیں۔

لِلّٰہِ الحمد کہ یہ نگاہ پھر طلوعِ اسلام ہی کی چشمِ بصیرت کو ارزانی ہوئی جس کے لئے ہم بارگاہ ربّ العزت میں سجدہ ریز ہیں۔ طلوعِ اسلام کی حالیہ کنونشن (منعقدہ ۲۴ تا ۲۷ اکتوبر) میں یہ مسئلہ بھی زیرِ غور آیا اور اس کے ایک اجلاس میں اس سلسلہ میں ایک قرارداد متفقہ طور پر "تالیوں کی گونج" میں منظور ہوئی۔ مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اس قرارداد کو خود مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے پیش کیا اور مختصر لیکن برجستہ الفاظ میں بتایا کہ حکومت کا یہ اقدام کس طرح قرآنی نظام کے خلاف ہے۔ یہ قرارداد کنونشن کی روئیداد کے ضمن میں اس شمارہ میں شائع ہو رہی ہے لیکن اس کی خصوصی اہمیت کی بنا پر اسے (الگ) درج ذیل بھی کیا جاتا ہے:۔

حال ہی میں مرکزی حکومتِ پاکستان نے وزارتِ امورِ مذہبیہ (MINISTRY FOR RELIGIOUS AFFAIRS) کی تخلیق و تشکیل کی ہے۔ مملکت میں مذہبی امور

کے لئے جداگانہ وزارت یا شعبہ کی تشکیل سیکولر نظامِ حکومت کا پیدا کردہ تصور ہے جس میں دنیاوی اور مذہبی امور میں ثنویت (DUALISM) ہوتی ہے۔ اسلام اسی ثنویت کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ اس لئے اسلامی مملکت میں مذہبی امور کے لئے جداگانہ وزارت قائم نہیں ہوسکتی۔ اسلامی مملکت کا ہر شعبہ اور ہر وزارت اسلامی (لہٰذا عرفِ عام میں مذہبی) ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر ساری کی ساری مملکت دینی ہوتی ہے۔ خود مروجہ آئینِ پاکستان میں کہا گیا ہے کہ "مملکت کا مذہب اسلام ہوگا"۔ جب پوری کی پوری مملکت کا مذہب اسلام ہے تو اس میں امورِ مذہبی کے لئے جداگانہ وزارت کا قیام، مملکت کے اِس بنیادی دعویٰ کے خلاف ہے۔

طلوعِ اسلام "کنونشن کا یہ اجلاس مرکزی حکومتِ پاکستان سے مستدعی ہے کہ وہ اپنے اس فیصلہ پر نظرِ ثانی کر کے اس وزارت کا قیام ختم کر دے۔ اور پوری کی پوری مملکت کو اسلامی بنانے کے لئے عملی اقدامات کرے جس کا طریق یہ ہے کہ وہ جملہ امورِ مملکت کا فیصلہ قرآنِ مجید کی روشنی میں کرتی چلی جائے۔ اس سے مملکت کی ہر وزارت دنیاوی بھی ہوگی اور مذہبی بھی۔

اس قرارداد کی نقول الگ خطوط کے ساتھ محترم صدرِ مملکت، وزیرِ اعظم پاکستان، وزارت قانون (مرکزی حکومتِ پاکستان) کی خدمت میں بھیجی گئی ہیں اور اخبارات کو بھی۔ "طلوعِ اسلام" چونکہ عملی سیاسیات میں حصہ نہیں لیتا اس لئے ہم اتنا ہی کر سکتے تھے۔ یہ ہمارا قرآنی تقاضا اور دینی فریضہ تھا۔ اگر آج اس کا کوئی اثر نہ بھی ہوگا تو بھی آنے والا مورخ اتنا تو دیکھ سکے گا کہ ایک مملکت کو "اسلامی" قرار دینے کے بعد اس میں جو غیر اسلامی تصورات عام کئے جاتے تھے تو کوئی گوشہ ایسا بھی تھا جہاں سے ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی تھی — اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ (۱۱/۸۸) — ہم اس حقیقت کا واضح الفاظ میں اعلان کر دینا چاہتے ہیں کہ جس طرح اسلام اور سرمایہ داری ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے، اسلام اور ملوکیت (سیکولرازم) ایک جگہ نہیں رہ سکتے، اسی طرح اسلام اور مذہبی پیشوائیت بھی یکجا نہیں ہو سکتے۔ جو مملکت مذہبی پیشوائیت سے متاثر ہوگی وہ کبھی اسلامی نہیں بن سکے گی۔ اسلامی نظام کے قیام کے "اِلَّا" کی شرطِ اولین "لا" ہے۔ یعنی ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ۔ پاکستان میں جس تیزی سے مذہبی پیشوائیت کا احیاء ہو رہا ہے، اتنی ہی تیزی سے یہاں اسلام کے احیاء کے امکانات پیچھے ہٹتے جا رہے ہیں۔

—— (۰) ——

قراردادیں

قرارداد نمبر ۱ منظور کردہ طلوعِ اسلام کنونشن باجلاس مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۴ء

حکومت پاکستان نے مرزا غلام احمد قادیانی کی اُمت کو غیر مسلم قرار دے کر ایک ایسی حقیقت کا اعتراف اور اعلان کیا ہے جسے اسّی، نوّے سال تک مقدس فریب کے نقابوں میں چھپایا گیا۔ حکومت کا یہ اقدام ہی کچھ کم مستحقِ تبریک و تہنیت نہیں، لیکن جس انداز سے یہ قدم اٹھایا گیا وہ اس سے بھی کہیں زیادہ درخورِ تحسین و آفرین ہے۔ حکومت نے قانون کی رُو سے اس کا فیصلہ کر کے اس حقیقت کا اعلان کر دیا ہے کہ اسلامی مملکت میں وہ تمام امور جنہیں غلط فہمی یا غلط اندیشی کی بنا پر مذہبی کہا جاتا ہے، مذہبی پیشوائیت کے دائرۂ اقتدار میں نہیں رہتے بلکہ مملکت کے فرائض میں داخل ہو جاتے ہیں اور ان کا فیصلہ علماء کے فتووں سے نہیں بلکہ حکومت کے قانون کی رُو سے ہوتا ہے۔

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس مرکزی حکومتِ پاکستان کو اس کے اس فیصلے پر ہدیۂ مبارک باد پیش کرتا ہوا اربابِ حکومت سے مستدعی ہے کہ وہ اسی طریق سے پاکستان کے جملہ مسائل (مذہبی اور دنیاوی کی تفریق کے بغیر) قرآنِ کریم کی روشنی میں حل کرتے جائیں۔ اس طرح یہ مملکت رفتہ رفتہ کاملتہً اسلامی بن جائے گی اور وہ مقصدِ عظیم پورا ہو جائے گا جس کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا تھا۔

قرارداد نمبر ۲

حال ہی میں مرکزی حکومتِ پاکستان نے وزارتِ امورِ مذہبیہ (MINISTRY FOR RELIGIOUS AFFAIRS) کی تخلیق و تشکیل کی ہے۔ مملکت میں مذہبی امور کے لئے جداگانہ وزارت یا شعبہ کی تشکیل سیکولر نظامِ حکومت کا پیدا کردہ تصور ہے۔ جس میں دنیاوی اور مذہبی امور میں ثنویت (DUALISM) ہوتی ہے۔ اسلام اس ثنویت کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ اس لئے اسلامی مملکت میں مذہبی امور کے لئے جداگانہ وزارت قائم نہیں ہو سکتی۔ اسلامی مملکت کا ہر شعبہ اور ہر وزارت اسلامی (لہٰذا عرفِ عام میں مذہبی) ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر ساری کی ساری مملکت دینی ہوتی ہے۔ خود مروّجہ آئین پاکستان میں کہا گیا ہے کہ "مملکت کا مذہب اسلام ہوگا" جب پوری کی پوری مملکت کا مذہب اسلام ہے تو اس میں امورِ مذہبی کے لئے جداگانہ وزارت کا قیام، مملکت کے اس بنیادی دعویٰ کے خلاف ہے۔

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس مرکزی حکومتِ پاکستان سے مستدعی ہے کہ وہ اپنے اس فیصلہ پر نظرِ ثانی کر کے اس وزارت کا قیام ختم کر دے اور پوری کی پوری مملکت کو اسلامی بنانے کے لئے عملی اقدامات کرے جس کا طریق یہ ہے کہ وہ جملہ امورِ مملکت کا فیصلہ قرآنِ مجید کی روشنی میں کرتی چلی جائے۔ اس سے مملکت کی ہر وزارت دنیاوی بھی ہوگی اور مذہبی بھی۔

(باقی صفحہ ۶۲ پر)

باسمہٖ تعالیٰ

اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

مقصود بالذات کیا ہے؟

فرد ــ یا ــ مملکت

طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۴ء

ــــــ سے ــــــ

پرویز صاحب کا خطاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اصل مقصود کیا ہے؟

فرد — یا — مملکت

عزیزانِ گرامی قدر۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ

انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا بنیادی اور اس کے ساتھ ہی مشکل ترین سوال یہ ہے کہ فرد مملکت کے لئے ہے یا مملکت فرد کے لئے۔ یعنی ان میں مقصود (End) کونسا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ (Means) کونسا؟ یہی میرے آج کے خطاب کا موضوع ہے — وہ موضوع جس پر دنیا کے بڑے بڑے محققین نے تحقیق کی ہے اور بڑے بڑے مفکرین نے بہت کچھ کہا ہے۔ جیسا کہ آپ حضرات کو علم ہے، میں قرآن کریم کا طالب العلم ہوں۔ اس لئے میری پیش کش کا محوری نقطہ یہ ہوگا کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔ وبیدہ التوفیق۔

انسان مدنی الطبع واقعہ ہوا ہے یعنی اس کی زندگی کا تقاضا ہے کہ یہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مل جل کر رہے۔ مغربی مفکر، نطشے کے الفاظ میں — "انسان، دوسرے انسانوں کے اندر رہ کر ہی انسان بن سکتا ہے"۔ ہمارا مشاہدہ بھی اس حقیقت کی تصدیق کرتا ہے۔ کسی انسانی بچے کو اس کی پیدائش کے ساتھ ہی کسی ایسے جنگل میں چھوڑ دیا جائے جہاں کوئی دوسرا انسان نہ ہو، اور اسے کوئی جانور پالے پوسے، تو وہ ساری عمر جانور ہی رہے گا۔ قامتِ آدمیت اختیار نہیں کر سکے گا۔ اگرچہ پیکر (شکل و صورت) کے لحاظ سے وہ دوسرے آدمیوں جیسا ہی ہوگا۔ دوسری طرف، انسانی ذہن جس قدر سزائیں وضع کر سکا ہے، ان میں قیدِ تنہائی (Solitary confinement) سنگین ترین اور شدید ترین سزا ہے۔ بڑے بڑے متصلب، فولادی اعصاب رکھنے والے مجرم جو سزائے موت تک سے بھی نہیں گھبراتے، قیدِ تنہائی سے چیخ اٹھتے ہیں خواہ اس میں کوئی بدنی اذیت نہ بھی ہو۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ہم قبر کے عذاب کے تصور سے جس قدر ڈرتے، لرزتے ہیں، حشر کے عذاب کے منظر سے اس قدر نہیں کانپتے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ قبر میں مردہ تنہا ہوتا ہے، حشر میں ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں، انسانوں کے ساتھ۔ حتیٰ کہ کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ — مرگِ انبوہ جشنے وارد — اور "آدمی آدمی کا دارو ہوتا ہے"۔ ہمارے ہاں کا قدیم محاورہ ہے۔ خود لفظ معاشرہ کے اندر عشرہ (۱۰) کا مفہوم مضمر ہے جو ایک (اکیلے) ہندسہ کے ساتھ دوسرے ہندسہ کے ملنے سے مرتب ہوتا ہے خواہ وہ دوسرا ہندسہ، صفر ہی کیوں نہ ہو۔ جب تک ایک فرد کے ساتھ دوسرا فرد نہ ملے، معاشرہ کا وجود ہی عمل میں نہیں آسکتا۔

قبائلی زندگی

انسان کے اولین دورِ زندگی میں، ایک خاندان ہی اجتماعی زندگی کی بنیاد بنتا تھا۔ اس لئے خاندان کے ساتھ وابستگی، افراد کے تمدنی یا معاشرتی تقاضا کو پورا کر دیتی تھی۔ خاندان نما وسیع ہوا تو اس نے قبیلہ کی شکل اختیار کر لی۔ قبائلی زندگی عام طور پر خانہ بدوشی کی (Nomadic) ہوتی تھی۔ آج یہاں، کل وہاں۔ بلکہ ہر صبح سفر، ہر شام سفر۔ اس لئے قبائل کے لئے علاقوں کی تخصیص کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب انہوں نے گلہ بانی اور پھر زرعی معیشت اختیار کی تو علاقہ کی تحدید اور تخصیص کا سوال پیدا ہوا۔ یہ زمین فلاں قبیلہ کی ہے، وہ چراگاہ فلاں کی۔ اس طرح انسانی ذہن میں وہ تصور ابھرا جس نے آگے جا کر ملک یا وطن کی شکل اختیار کر لی۔ یہ میرا وطن ہے، وہ ہمارا ملک ہے۔ کرۂ ارض پر یہ لکیریں فطرت کی کھینچی ہوئی نہیں، انسانوں کی وضع کردہ ہیں۔

اس سے پہلے، تحفظِ خویش کا تقاضا، افراد کی جان (یا زیادہ سے زیادہ ان کے مال مویشی) کی حفاظت تک محدود تھا۔ اب وہ پھیل کر وطن یا ملک کی حفاظت کو بھی محیط ہو گیا۔ یعنی اب حفاظت کا سوال، افراد کی جان مال کی حفاظت تک محدود نہ رہا، بلکہ اس سے کہیں زیادہ، ملک کی حفاظت بن گیا۔ افراد کے باہمی تنازعات کے تصفیہ اور ملک کی حفاظت کے لئے، ایک صاحبِ اقتدار اجتماعی ادارہ کی ضرورت لاینفک بھی۔ یوں حکومت یا ہیئتِ حاکمیہ کا تصور ابھرا۔ ایک عرصہ دراز تک، انسانوں کی سیاسی یا تمدنی زندگی کا تصور، ملک اور اس کی حکومت تک محدود رہا۔ لیکن اس کے بعد حکمائے یونان، بالخصوص افلاطون (Plato) نے ایک اور تصور اجاگر کیا۔ جسے مملکت یا اسٹیٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عمومی نگاہ سے (بلکہ میرے نزدیک فی الحقیقت) دیکھا جائے تو مملکت سوائے اس کے کیا ہے کہ ایک ملک ہے جس کے اندر ایک حکومت قائم ہے، لیکن سیاسی فلسفہ (پولیٹیکل فلاسفی) نے اس تصور پر وہ رد سے چڑھائے کہ یہ کچھ سے کچھ بن گئی۔ اس سے پہلے مسئلہ سیدھا سادہ اور صاف تھا۔ ملک سے مراد ایک مخصوص خطۂ زمین تھا جس کی حفاظت سے مقصود اس ملک کے اندر بسنے والے افراد کی جان، مال وغیرہ کی حفاظت تھا اور یہ مقصد ایک نظام کے تابع حاصل ہوتا تھا جسے حکومت کہا جاتا تھا۔ لیکن جب سے مملکت یا اسٹیٹ کہہ کر پکارا گیا تو اس قسم کے سوالات پیدا ہونے شروع ہو گئے کہ مملکت اور افراد کا باہمی تعلق کیا۔ ان میں مقصد کون ہے اور ذریعہ کون۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلہ میں مختلف نظریات قائم کئے گئے مثلاً:

(۱) نظریۂ وحدت (Monistic Theory) اس سے مفہوم یہ ہے کہ افراد، مملکت کا جزو ہوتے ہیں۔ اپنا الگ وجود نہیں رکھتے۔

(۲) نظریۂ انفرادیت (Monadistic Theory) جس کی رو سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ مملکت محض افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔

(۳) نظریۂ ثنویت (Dualistic Theory) جس سے مفہوم یہ ہے کہ افراد کا جداگانہ وجود ہے لیکن وہ اپنی فلاح اور بہبود کے لئے مملکت یا معاشرہ (سوسائٹی) کے محتاج ہیں۔

یہاں تک تو پھر بھی خیر تھی، لیکن اس کے بعد ایک ایسا نظریہ قائم کیا گیا جس کی رو سے مملکت نے ایک

مستقل بالذات حیثیت اختیار کرلی۔ اسے نظریہ مطلقیت (Idealistic Theory) یا (Absolute Theory) کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ میرے اس خطاب کا موضوع پولیٹیکل سائنس کی رو سے نظریہ مملکت کی وضاحت نہیں۔ میرا موضوع فرد اور مملکت کا باہمی تعلق ہے۔ اس لئے میں مملکت کے مختلف نظریات کے متعلق تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ مختلف نظریات کے اس مختصر سے تعارف کے بعد اپنے موضوع کی طرف بڑھنا چاہتا ہوں۔ چونکہ ان نظریات میں سے نظریہ مطلقیت کا موضوع زیر نظر کے ساتھ بنیادی تعلق ہے اس لئے اس سلسلہ میں ذرا تفصیل سے کام لینا ضروری ہے۔ مغربی مفکر ہابس (Hobbes) نے اس نظریہ کا ابتدائی تصور پیش کیا تھا جب کہا تھا کہ افراد درحقیقت مملکت کے غلام ہوتے ہیں لیکن اس کی تکمیل مشہور جرمن فلاسفر ہیگل نے کی ہے۔

ہیگل کا نظریہ مملکت

ہیگل کے پیش کردہ تصور کی رو سے یہ کہا جاتا ہے کہ مملکت ایک زندہ نامی وجود (Organism) کا نام ہے جو اپنی جداگانہ ہستی اور منفرد تشخص رکھتی ہے۔ ہر زندہ اور صاحب شعور وجود کی طرح اس کی اپنی خواہشات، اپنے جذبات اور اپنے ارادے ہوتے ہیں۔ اس کے حقوق اور اختیارات لامحدود ہیں۔ یہ اپنے معاملات میں کسی اخلاقی ضابطہ کی پابند نہیں۔ اس کی مصلحت کوشی اور حصولِ مفادِ خویش خود ایک ضابطۂ اخلاق ہے جس کے خلاف کہیں کوئی اپیل نہیں ہو سکتی۔ جب کبھی افراد اور مملکت میں اختلاف ہو تو مملکت کو ہمیشہ حق بجانب تصور کیا جائے گا۔

مملکت کے حقوق مطلق (Absolute) ہوتے ہیں۔ مشہور جرمن + امریکی مفکر (Cassirer) نے ہیگل کے اس نظریہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> State is the self-certain absolute mind which acknowledges no abstract rules of good and bad, shameful and mean, craft and deception.
>
> (Myth of the State. P.264)

وہ دوسری جگہ لکھتا ہے۔

> یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سب سے اہم فریضہ مملکت کے مفاد کا تحفظ ہے۔ مملکت وہ روح عظیم ہے جو ساری دنیا میں حلول کئے ہوئے ہے۔ دنیا میں سنت اللہ (خدا کی روش) مملکت کی شکل میں کارفرما ہوتی ہے۔ مملکت کے متعلق بس یوں سمجھئے کہ خدا بذاتِ خود اس کے ہیکل میں زمین پر اتر آیا ہے۔ جہاں تک ضوابطِ اخلاق کا تعلق ہے مملکت صرف ایک صداقت کو تسلیم کرتی ہے۔ اور وہ صداقت ہے قوت، لامحدود قوت۔ (ایضاً ص ۲۶۵)

ہیگل نے یہ نظریہ انیسویں صدی کے شروع میں (۱۸۰۱ء) میں پیش کیا اور رفتہ رفتہ یہ ساری دنیا میں پھیل

گیا۔ (Tubingen University) کے چانسلر (Rumelin) نے ۱۸۷۵ء میں کہا تھا کہ

> مملکت اپنے اختیارات میں نادر مطلق واقعہ ہوئی ہے۔ مفادِ خویش کا تحفظ اس کا واحد فریضہ ہے۔ اس کے نزدیک، اپنی قوت اور مرفہ الحالی کا حصول و استحکام، دنیائے سیاست کا بلند ترین اصول ہے۔ اسے کسی دوسری مملکت کا خیال صرف اس صورت میں رکھنا چاہیئے، جب اس سے اس کے اپنے مفاد پر کسی قسم کی زد نہ پڑتی ہو۔ مملکت کا استحکام اور بقا، ہر قسم کی قربانی کی وجہ جواز ہے اور ہر قسم کے اخلاقی قاعدہ اور قانون سے اعلیٰ وارفع۔ فرد کے لئے اصولِ حیات، خود سپردگی ہے اور مملکت کے لئے تغلبِ خویش۔

(Murray, Individual And The State. P. 216)

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس نظریہ کی رو سے مملکت کو خدائی اختیارات و اقتدارات کا حامل بنا دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس نہج فکر و طریق عمل کو کہا ہی (Divinisation of State) جاتا ہے — یعنی مملکت کو الٰہ بنا دینا۔ اس طرح، مملکت ایک معبود بن جاتی ہے اور فرد، اس کے پرستار، یہ ایک جدید مذہب ہے جس کے اپنے اعتقادات و ضوابطِ اخلاق ہیں۔ اس مذہب میں مملکت کو خدا کا درجہ دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اس نظریہ کو ہیگل نے وضع کیا تھا۔ لیکن یہ رفتہ رفتہ اس قدر عام ہوتا چلا گیا کہ اب یہ ساری دنیا کا "مذہب" بن چکا ہے — اصطلاحات میں فرق ہوگا۔ الفاظ بھی مختلف ہوں گے لیکن حقیقت اور روح کے اعتبار سے اب دنیائے سیاست میں، ہر جگہ مملکت کو یہی حیثیت حاصل ہے۔ ہر جگہ، اسٹیٹ کا لفظ اس طرح بولا جاتا ہے، گویا یہ سچ مچ کی کوئی جیتی جاگتی شخصیت ہے جس کی حیثیت دیوی، دیوتا یا معبود کی سی ہے — عصرِ حاضر کے تراشیدہ بتوں کے متعلق جب اقبال[2] نے کہا تھا کہ — ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — تو اس سے اس کی یہی مراد تھی۔ اس کے مقامِ الوہیت اور منصبِ معبودیت کا یہ عالم ہے کہ جب کہا جائے کہ اسٹیٹ کا یہ تقاضا ہے تو پھر کسی شخص کی مجال نہیں کہ اس پر کسی قسم کی تنقید کر سکے۔ اس کے خلاف لب کشائی کر سکے۔ اسٹیٹ کے تقاضا یا حکم کے مقابلہ میں، فرد کے کسی مفاد، مصلحت، تقاضا، آرزو، خواہش، جذبہ کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ افراد پیدا ہی اس لئے ہوتے ہیں کہ وہ مملکت کے غلام، اور اس کے تقاضوں کے روبہ عمل لانے کا ذریعہ بنیں۔ اسٹیٹ کے مقابلہ میں افراد کی اپنی ہستی کوئی نہیں ہوتی۔ ہستی صرف مملکت کی ہوتی ہے۔ اس کے لئے افراد کو ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ جب اس کا کوئی مطالبہ ہو تو فرد کا فریضہ ہے کہ اسے بلا تامل پورا کر دے۔ جو کچھ وہ مانگے اس کے حضور بلا توقف پیش کر دے حتیٰ کہ جان تک بھی۔

گذشتہ سو ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں اسٹیٹ کی اس حیثیت کے متعلق اس قدر منظم پراپیگنڈہ کیا گیا ہے کہ لوگوں کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو چکی ہیں۔ جب کہا جاتا ہے کہ اسٹیٹ کا تقاضا یہ ہے یا اس کا حکم یہ، تو کوئی شخص نہ اتنا سوچتا ہے، نہ پوچھتا کہ وہ اسٹیٹ ہے کہاں جس نے یہ حکم دیا ہے۔ وہ رہتی کہاں

ہے۔ اس کا پتہ نشان کیا ہے۔ کیا اس سے ملنے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے جو اس سے دریافت کر لیا جائے کہ آیا یہ حکم اس نے دیا ہے؟ نہ کوئی اتنا پوچھتا ہے، نہ کوئی بتاتا۔ لیکن اسٹیٹ ہے کہ اپنے احکامات نافذ کئے جاتی ہے اور افراد آنکھیں بند کئے اس کی تعمیل کئے جاتے۔ اسٹیٹ کے معبود کا تقدس اور اس کے اقتدارِ مطلق کا تصور ہر شخص کے قلب و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ لوگ ہستی باری تعالےٰ کے متعلق تو ثبوت مانگیں گے، لیکن مملکت کی ہستی کے متعلق نہ کوئی ثبوت طلب کرے گا نہ کسی دلیل و برہان کا تقاضا۔ اس کی ان دیکھی ہستی' اور اس کے لا انتہا اختیارات کو اس طرح بلا چون و چرا تسلیم کر لیا جاتا ہے گویا وہ ایک حقیقت ثابتہ ہے جو کسی دلیل و برہان کی محتاج نہیں۔

مملکت کی حقیقت

لیکن جس ہستی کو اس طرح بلا دلیل و ثبوت تسلیم کر لیا جاتا ہے' اگر آپ ذرا ٹھنڈے دل سے تجزیہ کریں اور اوران موہوم پردوں کو اٹھا کر دیکھیں تو معلوم ہے آپ کو اس کے پیچھے نظر کیا آئے گا؟ وہی جو محمود غزنوی کو سومنات کے مندر میں نظر آیا تھا۔ محمود نے جب سومنات کو فتح کیا تو اس مندر کی مورتی کے متعلق طرح طرح کے خارق عادات افسانے زبان زدِ خلائق تھے۔ ان میں سب سے زیادہ حیرت افزا یہ تھا کہ لوگ جب اس سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں' تو وہ ان کا جواب دیتی ہے جسے سب سنتے ہیں۔ محمود تو توحید پرست تھا' وہ ان شعبدہ بازیوں کے دام فریب میں کب آسکتا تھا' اس نے مندر کی ہیئت کذائی پر گہری نظر ڈالی اور حقیقت کو فوراً بھانپ لیا۔ اس نے ایک ضرب سے مورتی کی پچھلی دیوار کو توڑا تو دیکھا کہ اس کے پیچھے پجاری بیٹھے ہیں جو لوگوں کی مانگ کا جواب دیتے ہیں۔ آپ جب مملکت کی مورتی کا پردہ اٹھائیں گے تو آپ کو نظر آجائے گا کہ اس کے پیچھے چند اربابِ اقتدار بیٹھے ہیں جنہوں نے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے۔ انہی کے احکام مملکت کے احکام انہی کے فیصلے مملکت کے فیصلے' انہی کے مفادات مملکت کے مفاد' اور انہی کے تقاضے مملکت کے تقاضے بن کر سامنے آتے رہتے ہیں۔ یہ اربابِ حکومت' مملکت کے معبود کے نام پر' افرادِ معاشرہ سے اپنی پرستش کراتے ہیں۔ اس تجزیہ' یعنی پردہ اٹھا دینے کے بعد آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں مملکت کا کوئی الگ وجود نہیں رہتا۔ یہ صرف ایک تجریدی تصور (Abstract idea) بن کر رہ جاتی ہے۔ ٹھوس حقیقت اسی قدر ہے کہ ایک ملک ہے اور اس کے اندر ایک حکومت، یعنی اربابِ حکومت۔ آپ دیکھئے اور بار بار دیکھئے کہ ان دو ٹھوس چیزوں کے علاوہ اس بت کدہ میں آپ کو کوئی تیسری چیز نظر آتی ہے؟ اصل یہ ہے کہ دنیا میں جب ملوکیت بدنام ہوئی تو انسانوں کی ہوسِ اقتدار اور لذتِ استبداد نے ایک اور پیکر تخلیق کیا اور اس کا نام مملکت رکھ دیا۔ جو آمریت، ملوکیت کے پیکر میں بدنام ہو چکی تھی اسے اب تقدس کے اس موہوم پردے میں سندِ الوہیت عطا ہو گئی۔ اب نظامِ حکومت کچھ اور کیا ہی کیوں نہ ہو' اس میں روح اسی ملوکیت کی کارفرما ہو گی۔ انسان کے دورِ جاہلیت میں' بادشاہ اپنے احکام' اپنے نام سے جاری کرتا تھا۔ اب دورِ تہذیب ہے اس لئے وہی احکام' مملکت کے نام سے جاری ہوتے ہیں۔ اس مملکت کے

نام سے جس کا ارباب حکومت سے الگ کوئی وجود نہیں ہوتا۔ احکام اُس زمانے میں بھی صاحب اقتدار کے ہوتے تھے۔ احکام اب بھی اربابِ اقتدار کے ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جب احکام بادشاہ کے نام سے جاری ہوتے تھے تو وہ اُن کی ذمہ داری بھی قبول کرتا تھا اور رعایا بھی جانتی تھی کہ ان کا ذمہ دار کون ہے۔ اب جو احکام مملکت کے نام سے صادر ہوتے ہیں، نہ کوئی شخص ان کی ذمہ داری قبول کرتا ہے اور نہ ہی یہ متعین کیا جا سکتا ہے کہ ان کا ذمہ دار ہے کون؟ اُس زمانے میں غلط احکام کی وجہ سے بادشاہ بدنام ہو جاتا تھا، اب ایسے احکام سے کوئی بدنام نہیں ہوتا کیونکہ یہ احکام مملکت کے ہوتے ہیں جس کا وجود ذہنوں سے خارج کہیں نہیں ہوتا۔

دورِ جاہلیت میں اس قسم کے موہوم صاحب اقتدار کو دیوی دیوتا، کہا جاتا تھا، اب اسے مملکت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ جس طرح نہ کوئی شخص دیوی، دیوتاؤں کو دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی ان کے احکام پر کسی قسم کی تنقید کر سکتا، اسی طرح اب نہ کوئی شخص مملکت کی دیوی کو دیکھ سکتا ہے، نہ اس کے احکام پر تنقید کر سکتا۔ افراد، اُس وقت، جگن ناتھ کے رتھ کے نیچے کچلے جاتے تھے، اب ملوکیت کی دیوی کی قربانگاہ پر ذبح کر دیئے جاتے ہیں۔ مقصد اُس وقت بھی دیوی کے پجاریوں کے جذباتِ خون آشامی کی تسکین تھا۔ مقصد اب بھی وہی ہے۔ فرق صرف الفاظ اور اصطلاحات کا ہے۔ ہمارے زمانے میں الفاظ کا استعمال کیا کچھ کرتا ہے امریکہ کا مشہور ماہر نفسیات (Erich Fromm SELF.) اپنی کتاب (Escape From Freedom) میں لکھتا ہے۔

> حقائق کو چھپانے کے لئے الفاظ کا غلط استعمال جس قدر آج کیا جاتا ہے اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اب اپنے رفتار سے فراری کا نام (Appeasement) رکھ دیا جاتا ہے۔ فوجی جارحیت کو اپنی مدافعت (Defence) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ کمزور قوموں کو محکوم بنانے کا نام "دوستی کا معاہدہ" رکھ دیا جاتا ہے اور پوری کی پوری آبادی کو وحشیانہ طریق سے مغلوب کرنے کا نام نیشنل سوشلزم۔ (P. 351)

اور ہم اس پر یہ اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ عہدِ قدیم کی ملوکیت کو مملکت کی اصطلاح میں چھپا دیا گیا ہے اور اسے ایسا مبہم ہی نہیں، موہوم رکھا گیا ہے کہ اس کا کوئی واضح تصور ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔ اس کے باوجود، اس فریبِ تخیل کو ایسا حقیقی بنا دیا گیا ہے کہ افراد کو بلا تامل اس کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ اور یہ سب اِس نظریہ کے ماتحت کہ افراد کا وجود مملکت کے قیام کے لئے ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کا ثبوت کیا ہے کہ افراد کا وجود مملکت کے قیام کے لئے ہے؟ اس کا ثبوت ہے ارسطو کی ایک تشبیہ!

تشبیہات کی شعبدہ بازی

یاد رکھئے! دنیائے انسانیت کو تشبیہات کے غلط استعمال نے جس قدر نقصان پہنچایا ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ غلط تشبیہ، باطل کو حق کر کے دکھا دیتی ہے۔ بڑے سے بڑا زیرک انسان بھی،

نہایت آسانی سے اس کے فریب میں آجاتا ہے۔ حقیقت چونکہ غیر محسوس ہوتی ہے اس لئے وہ آسانی سے ذہن میں جگہ نہیں پکڑتی۔ لیکن تشبیہ محسوس اشیاء سے دی جاتی ہے اس لئے وہ فوراً ذہن سے چپک جاتی ہے۔ اگر وہ تشبیہ برحق ہے تو اس سے مجرد حقیقت آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ لیکن اگر وہ فریب انگیز ہے تو وہ حق کو باطل اور باطل کو حق بنا دیتی ہے۔ قرآن کریم باعث فریب تخیل تشبیہات کو "شاعری" کہہ کر پکارتا ہے اور اس سے دور رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ تصوف کا سارا کاروبار تشبیہات کے سر پر چلتا ہے اس لئے شاعری اس کا سہارا بنتی ہے۔ علی حزیں نے اسی لئے تو کہا تھا کہ ــــ تصوف برائے شعر گفتن خوب است ــــ ایک آدھ مثال سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ تصوف کا ایک عقیدہ وحدت وجود ہے۔ جس کا مفہوم (مختصر اور سیدھے سادے الفاظ میں) یہ ہے کہ کائنات میں جتنی چیزیں نظر آتی ہیں ان کا اپنا وجود کوئی نہیں۔ وجود صرف خدا کا ہے۔ خدا نے مختلف پیکر اختیار کر رکھے ہیں۔ ان چیزوں کے مختلف ناموں اور مختلف پیکروں سے ہم دھوکا کھا جاتے ہیں ورنہ حقیقت سب کی ایک ہے۔ مذاہب کے تمام جھگڑے تنازعے بھی، ناموں کے اسی اختلاف کی وجہ سے ہیں ورنہ حقیقت ہر جگہ ایک ہی ہے۔ وہی رام ہے وہی رحیم۔ وہی بتکدہ میں ہے وہی کعبہ میں۔ ظاہر ہے کہ یہ تصور یا عقیدہ یکسر باطل ہے لیکن دیکھئے کہ ایک غلط تشبیہ، اتنے کھلے ہوئے فریب کو کس قدر حقیقت بنا کر دکھا دیتی ہے۔ وہ تشبیہ یہ ہے کہ

گنگا ایک گھاٹ بہتیرے ‏ ‏ ‏ کہت کبیر عقل کے پھیرے

آپ دیکھتے ہیں کہ ہزار دلائل ایک طرف اور یہ ایک تشبیہ ایک طرف۔ یہ تشبیہ اس طرح ذہن کے ساتھ چپک جاتی ہے کہ کوئی دلیل وہاں بار نہیں پا سکتی۔

یا مثلاً تصوف نے کہنا یہ ہوتا ہے کہ خدا سے براہ راست حصول فیضان ناممکن ہے۔ تجلیاتِ باری تعالیٰ جب مرشد کے فیضان سے ملتی ہیں تو وہ اثر انگیز ہوتی ہیں۔ اسے تشبیہاً یوں سمجھایا جاتا ہے کہ روئی کو سارا دن دھوپ میں رکھ چھوڑیئے وہ زیادہ سے زیادہ گرم ہو جائے گی۔ لیکن اگر سورج کی انہی کرنوں کو آتشیں شیشہ میں سے گزارا جائے تو چند ثانیوں میں روئی میں آگ بھڑک اٹھے گی۔ عشق خداوندی کی کرنیں جب نگہ مرشد کے آتشیں شیشہ میں سے گزرتی ہیں تو ایک ثانیہ میں مرید کے قلب کو شعلہ جوالہ بنا دیتی ہیں۔ جس سے ماسوی اللہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔

ارسطو کی تشبیہ

یہ ہے جو تشبیہات کا غلط استعمال کرتا ہے۔ دیکھئے کہ ارسطو کی تشبیہ کس طرح اس فریب کو حقیقت بنا کر پیش کر دیتی ہے کہ ہستی صرف مملکت کی ہے افراد کی نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مملکت اور افراد کی مثال، انسانی جسم اور اس کے اعضاء کی سی ہے۔ اعضائے جسمانی اپنا الگ وجود نہیں رکھتے۔ وہ صرف جسم کے حصے ہیں اور ان کی زندگی اور موت جسم کی زندگی اور موت کے ساتھ وابستہ ہے۔ ان کا فریضہ جسم کے لئے سامانِ زیست و صحت بہم پہنچانا ہے۔ اس سے خود ان کی زیست اور صحت کا انتظام

بھی ہو جاتا ہے۔ کوئی عضو جسم سے الگ ہو کر زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔ جسم کی مصلحت، اعضاء کی مصلحت ہے۔ اسلئے جسم سے الگ اعضاء کے لئے کوئی اپنے اصول وضوابط بھی نہیں ہو سکتے۔ نہ ہی اعضاء اپنی مرضی سے جسم کے حصے بنتے ہیں۔ نہ اپنی مرضی سے اس سے الگ ہو سکتے ہیں۔

اس تشبیہ کے بودا پن کے متعلق تو میں آگے چل کر بات کروں گا۔ یہاں آپ نے دیکھ لیا کہ جسم اور اعضاء کے اس رشتہ کی بنا پر افراد کا اپنا کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ وہ مملکت کے قیام، استحکام اور فروغ کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور مقصود بالذات مملکت قرار پا جاتی ہے اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اگر مملکت کے نظریہ کا تجزیہ کیا جائے تو وہاں چند افراد سے الگ کوئی شے نہیں رہتی جن کے ہاتھ میں اقتدار ہو۔ یہ ایک نگاہ فریب پردہ ہے جسے ڈکٹیٹر شپ یا کلی حکومت (Totalitarianism) کو چھپانے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ (جیسا کہ بتایا جا چکا ہے) اس نظریہ کو ہیگل نے وضع یا عام کیا۔ نیٹشے نے پروان چڑھایا ہٹلر نے اسے نازی ازم کے روپ میں ڈھالا۔ مسولینی نے فاشزم کا لبادہ اڑھایا اور اشتراکی ممالک میں اسے عوام کی آمریت (Dictatorship of Proletariat) سے تعبیر کیا گیا۔ جمہوری ممالک بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں آمریت نہیں، جمہوریت یعنی عوام کی حکومت ہے۔ لیکن یہ بھی فریب ہی ہے۔ مملکت کا تصور ان ممالک میں بھی وہی ہے جو آمریت کے حامل ممالک میں ہے۔ فرد کی ان کے ہاں بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ حال ہی میں امریکی ماہر نفسیات (Charles M.Fair) نے ایک دقیق لیکن حقیقت کشا کتاب شائع کی ہے جس کا نام اس کے نفس مضمون اور عصر حاضر کے بدنصیب انسان کی صحیح تصویر سامنے لے آتا ہے۔ یعنی (The Dying Self) اس میں اس نے بتایا ہے کہ عصر حاضر نے فرد کی انا (I-Am-Ness) کو کچلنے کے لئے کیا کیا حربے وضع کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ آمریت کو تو چھوڑیئے۔ اس باب میں ڈیماکریسی نے بھی جو گل کھلائے ہیں وہ اس سے کم نہیں۔ اس نے اپنے اس دعویٰ کی تائید میں (DE - Tocqueville) کی کتاب (Democraey In America) سے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔ ایک اقتباس آپ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ وہ کہتا ہے۔

> زنجیریں اور جلاد وہ کند ہتھیار تھے جنہیں مستبد قوتیں گذشتہ زمانے میں استعمال کرتی تھیں۔ یوں کہیئے کہ اس زمانے میں بادشاہوں نے استبداد کو مادی شکل دے رکھی تھی۔ لیکن دور حاضر کی جمہوریت نے اسے یکسر ذہنی مسئلہ بنا دیا ہے۔ اب آقا یہ نہیں کہتا کہ تم وہی سوچو جو میں سوچتا ہوں ورنہ تم قتل کر دیئے جاؤ گے۔ اب وہ کہتا ہے کہ تمہیں اس کی آزادی حاصل ہے کہ تم میری فکر سے الگ فکر رکھو۔ اس اختلاف کے باوجود تمہاری جان، مال اور دیگر مقبوضات سب محفوظ رہیں گی۔ صرف اتنا ہوگا کہ تم اپنوں میں اجنبی بن کر رہ جاؤ گے۔ تم انسانوں کے ساتھ رہو گے لیکن انسانی حقوق سے محروم کر دیئے جاؤ گے۔ تمہارے ہم جنس تم سے اسی طرح نفرت کرنے لگ جائیں گے جس طرح کسی نجس شے سے نفرت کی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ بھی جو تمہیں معصوم اور بے قصور جانتے

ہیں تم سے قطع تعلق کرلیں گے کہ لوگ کہیں ان سے بھی نفرت نہ کرنے لگ جائیں (ان سے یہ آقا کہتا ہے) جاؤ! امن میں رہو۔ میں نے تمہیں تمہاری زندگی بخش دی ہے لیکن یہ زندگی وہ ہے جو موت سے بھی بدتر ہے۔

(The Dying Self, P.185)

یہ ہوتی ہے فرد کی حالت جمہوریت میں۔ اس میں اکثریت کا ساتھ چھوڑ کر فرد ایسا شجر ممنوعہ (Wet paint) بن جاتا ہے کہ کوئی اس کے پاس تک آنا نہیں چاہتا۔ وہ بھری دنیا میں تنہا رہ جاتا ہے۔ بستے رستے معاشرے میں افراد کس قدر تنہا رہ جاتے ہیں اس کا اندازہ اس کتاب کے ٹائیٹل سے لگ سکتا ہے جو آج سے چند سال اُدھر امریکہ کے دو صحافیوں نے مرتب اور شائع کی تھی اور جس میں کوائف دستاویز اور اعداد و شمار سے بتایا گیا تھا کہ امریکی معاشرہ کی حالت کیا ہے۔ کتاب کا ٹائیٹل تھا (The Lonely Crowd) ایسے معاشرہ میں فرد بے شک دوسرے افراد کے ساتھ رہتا ہے لیکن اس طرح ساتھ جس طرح کسی مشین کا ایک پرزہ دوسرے پرزوں کے ساتھ رہتا ہے۔ میں نے گزشتہ دو تین سال کے دوران اپنے خطابات میں، ایک امریکی ماہر نفسیات (Erich Fromm) کی مختلف کتابوں کے اقتباسات اکثر پیش کئے ہیں۔ موضوع زیر نظر کے سلسلہ میں وہ اپنی کتاب (Escape From Freedom) میں جس کا ایک اقتباس پہلے بھی پیش کیا جا چکا ہے) لکھتا ہے۔

جو شخص اپنی انفرادیت کھو کر سوسائٹی کی مشینری کا پرزہ بن کر رہ جاتا ہے۔۔۔ اس قسم کا پرزہ جس قسم کے اور ہزاروں پرزے اس کے گردوپیش ہوتے ہیں وہ تنہا تو بیشک نہیں رہتا، اور خطرات سے بھی مامون ہو جاتا ہے، لیکن اس کے لئے اسے جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ یعنی اپنا تشخص، اپنی انفرادیت، اپنی ذات، اپنا (Self) [1] (P.209)

وہ اپنی ایک اور کتاب (The Revolution Of Hope) میں لکھتا ہے۔

جس معاشرہ میں انسان کو (de-humanised) کر دیا جائے یعنی لباسِ آدمیت سے عاری۔ اس میں سیاسی آزادی، آزادی نہیں رہتی، غلامی بن جاتی ہے۔

(P.91)

یہی مصنف آگے چل کر کہتا ہے۔

مملکت کا فریضہ، انسانی زندگی کا احترام ہے۔ مثبت یا عمل خیر وہ ہے جو فرد کی مضمر صلاحیتوں کی نمود میں معاون ہو۔ اور منفی یا عمل شر وہ جو زندگی کا گلا گھونٹ دے۔

---

[1] کس قدر پرشکوہ الفاظ میں بیان کر گیا ہے اقبالؒ اس حقیقت کو اس سے بہت پہلے۔

اگر یک ذرہ کم گردد ز انگیز وجودِ من
باین قیمت نمی ارزم حیاتِ جاودانی را

اور انسانی سرگرمیوں کو مفلوج کر دے۔ (P. 93)

(Ernst Cassirer) جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے' عصر حاضر کا نامور فلاسفر ہے جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ اس کی آخری تصنیف مسئلہ ملکت سے متعلق ہے جس کا نام ہے (The Myth Of The State)۔ وہ اس میں فرد اور ملکت کے حقوق پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے کہ ملکت کے جتنے حقوق اور اختیارات جی چاہے وضع کر لیجئے لیکن فرد کا ایک ایسا حق ہے جس سے اسے کوئی ملکت کسی صورت میں بھی محروم نہیں کر سکتی۔ اور وہ ہے اس کا حق انفرادیت (The right to Personality)۔ ملکت کا فرد کو اس حق سے محروم کر دینا تو ایک طرف' خود فرد کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ اپنے اس حق سے دستبردار ہو جائے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو اس نے اپنے تشخص کو ختم کر دیا۔ اپنی انسانیت کو تباہ کر دیا۔ (P. 175)

پروفیسر (I. McIver) اپنی کتاب (The Modern State) میں' ملکت کے حقوق و اختیارات پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

> ملکت حکمران اس لئے ہوتی ہے کہ وہ افراد کی خدمت گذار ہوتی ہے۔ وہ ملک کی دولت اپنے قبضہ میں اس لئے رکھتی ہے کہ اس سے اس نے افراد کا قرضہ ادا کرنا ہوتا ہے وہ حقوق کی تخلیق کرتی ہے۔ لیکن اس طرح نہیں کہ وہ مسند عالی پر بیٹھ کر خیرات بانٹتی ہے بلکہ اس لئے کہ وہ تخلیق حقوق کے لئے معاشرہ کی ایجنٹ ہوتی ہے۔ یاد رکھیئے! افراد آقا ہوتے ہیں اور ملکت خادم۔ اور یہ ظاہر ہے کہ خادم' اپنے آقا سے بڑا کبھی نہیں ہو سکتا۔ جس طرح انسانی حقوق ان کے فرائض کی نسبت سے متعین اور محدود ہوتے ہیں' اسی طرح ملکت کے حقوق کو (اس کی ذمہ داریوں کی نسبت سے) اضافی اور محدود ہونا چاہیئے۔ (P. 480)

اور یہیں سے ارسطو کی اس تشبیہ کا کھوکھلا پن واضح ہو جاتا ہے جس کے زور پر اس نے ملکت کو مقصد اور افراد کو ذرائع قرار دیا تھا ــــ یعنی جسم اور اعضاء کی تشبیہ

ارسطو کی تشبیہ کا کھوکھلا پن

اس نے یہ کہا ہے کہ وجود صرف جسم کا ہوتا ہے۔ اعضاء اپنا الگ وجود نہیں رکھتے۔ یہ دعویٰ حقیقت کے خلاف ہے۔ وجود دراصل اعضا اور جوارح کا ہوتا ہے جسم کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ جسم تو اعضا و جوارح کے ایسے مجموعہ کا نام ہوتا ہے جن میں باہمی ربط و ضبط اور تعاون و تناصر ہوتا ہے۔ آپ مختلف اعضاء ٹانگیں، بازو، دھڑ، سر وغیرہ کو الگ کر لیجئے۔ وہ تو الگ الگ پڑے دکھائی دیں گے لیکن جسم غائب ہو جائے گا۔ جسم کا وجود محض ذہنی اور تصوراتی (Conceptual) ہوتا ہے وہ موجود فی الخارج نہیں ہوتا۔ صحت مختلف اعضاء جوارح کی صحیح حالت کا نام ہے اور جب کوئی ایک

عضو، یا بعض اعضا اپنی صحیح حالت میں نہیں رہتے اور اس طرح اپنا فریضہ سرانجام نہیں دیتے تو اُسے بیماری کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی عضو زہر آلود ہو جائے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جسم کی حفاظت کے لئے اس کا کاٹ پھینکنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ایسا محض اس لفظ (جسم) کے عام استعمال کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ ورنہ، درحقیقت کہنا یہ چاہیئے کہ اس عضو کو، دیگر اعضا کی صحت اور سلامتی کے لئے کاٹ پھینکنا ضروری ہے۔ اس سے واضح ہے کہ افراد اپنا الگ تشخص اور وجود رکھتے ہیں۔ اور کوئی مملکت وجود میں نہیں آ سکتی جب تک افراد پہلے سے موجود نہ ہوں۔ مملکت نہ ہو تو افراد پھر بھی باقی رہ سکتے ہیں اور رہتے ہیں، لیکن افراد نہ رہیں تو مملکت کا تصور تک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب افراد باہمی رضامندی سے، باہمد گر ربط و ضبط، اور تعاون و تنظیم کی زندگی بسر کرنے کا عزم کر لیں اور اپنے حفظ و بقا کے لئے قوت فراہم کر لیں تو ان کے اس اندازِ زیست کو معاشرہ (سوسائٹی) یا مملکت سے تعبیر کیا جائے گا۔ یہ تشبیہ (کہ افراد اعضا ہیں، اور مملکت جسم) درحقیقت افلاطون (Plato) کے نظریۂ تقسیم کے لئے وضع کی گئی تھی۔ اس کے نظریہ کی رُو سے غلام ساری عمر غلام رہتا ہے اور حکمران طبقہ (جنہیں وہ Guardians) کہہ کر پکارتا تھا) ساری عمر حکمران۔ اور اس کی مثال جسم کے اعضا کی سی ہے۔ پاؤں ہمیشہ پاؤں رہتا ہے اور سر ہمیشہ سر۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ پاؤں اپنی صلاحیتوں کو بڑھا کر سر کی جگہ لے لے اور سر کو پاؤں کی جگہ رکھ دیا جائے۔ ہر عضو کا اپنا اپنا مقام ہے جو پیدائش کی رُو سے متعین ہوتا ہے اور اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کسی عضو کو نہ اس کی آرزو کرنی چاہیئے کہ میں فلاں عضو بن جاؤں، نہ ایسی کوشش۔ نہ ہی پست اعضا کو اپنی پستی کے احساس سے، اپنے فرائض مفوضہ چھوڑ کر سرکشی پر اتر آنا چاہیئے۔ افلاطون نے اس تشبیہ سے، طبقات کی تقسیم کو پیدائشی اور غیر متبدل قرار دے دیا، اور ارسطو نے اس تشبیہ سے افراد کو مملکت کا غلام بنا کر رکھ دیا۔ آپ نے دیکھا کہ تشبیہات کے غلط استعمال سے کس طرح حق کو باطل اور باطل کو حق بنا کر دکھا دیا جاتا ہے۔ اسے اقبال حکمران کی ساحری سے تعبیر کرتا ہے۔

ارسطو نے یہ تشبیہ مہیا کی اور ہیگل نے اس پر سیاست کی پوری عمارت استوار کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب دنیا میں ہر جگہ آمریت کا نظام قائم ہے، خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ اس اعتبار سے ڈکٹیٹر شپ مغربی ڈیماکریسی (جمہوریت) میں کوئی فرق نہیں۔

ہے وہی سازِ کہن، مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

اور ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے کبھی محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

حکمران کا یہ سحر، مملکت کے موہوم تصور کی رو سے کارفرما ہوتا ہے جسے مقصود بالذات اور افراد کو اس کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ قرار دیا جاتا ہے۔ (Erich Fromm) ڈکٹیٹر شپ اور

صحیح جمہوریت کے فرق کو ان الفاظ سے واضح کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

ڈیماکریسی اس نظام کا نام ہے جس میں ایسے معاشی، سیاسی اور ثقافتی حالات پیدا کئے جاتے ہیں جن میں فرد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے برعکس فاشزم اس نظام کو کہتے ہیں — خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے — جس میں فرد کو خارجی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا لیا جاتا ہے اور اس کی مضمر صلاحیتوں کو ابھرنے نہیں دیا جاتا۔

(Escape From Freedom P. 301)

برگسان اس اہم نکتہ کی تشریح ان الفاظ میں کرتا ہے۔

مملکت کا اقتدار انسانوں پر نہیں چیزوں پر ہونا چاہیئے (اور وہ بھی اس طرح کہ) کسی انسان کا دوسرے انسان پر کوئی اقتدار نہ رہے۔

(The Two Sources Of Religion And Morality. P.300)

ہوسِ اقتدار

(Cassirer) کہتا ہے کہ مملکت کا یہ کلی، آمرانہ، ہمہ گیر، مستبدانہ نظریہ لوگوں کی ہوسِ اقتدار (Love for power) کا وضع کردہ ہے۔ اس ہوس کے متعلق وہ لکھتا ہے۔

ہم دنیا میں کوئی آرزو محض آرزو کے لئے نہیں کرتے۔ ہر آرزو کسی مقصد کے حصول کے لئے ہوتی ہے اور جب وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو اس سے اس آرزو کی تسکین ہو جاتی ہے۔ لیکن اقتدار ایک ایسی آرزو یا خواہش ہے جو کسی مقصد کے حصول کی خاطر نہیں ہوتی۔ یہ اپنا مقصد آپ ہوتی ہے اس لئے ناقابلِ تسکین ہوتی ہے۔ اس میں کبھی اطمینان اور سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ ایسی (جھوٹی) پیاس ہوتی ہے جو کبھی بجھتی نہیں۔ جو لوگ اس مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ان کی مثال ایسے شخص کی سی ہوتی ہے جو چھلنی میں پانی ڈالے جا رہا ہے۔ چھلنی میں عمر بھر پانی ڈالتے جائیے وہ کبھی بھر نہیں سکتی۔ افلاطون اس مرض کو جوع الکلب (کتے کی بھوک) کہہ کر پکارتا ہے۔ ھل من مزید کی ہوس تمام پیمانوں کو توڑ کر رکھ دیتی ہے اور چونکہ — افلاطون کے نزدیک — پیمانے یا صحیح تناسب ہی پبلک یا پرائیویٹ زندگی کی صحت کا معیار ہوتے ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ جب ہوسِ اقتدار کی پیمانہ شکنی اور معیار فراموشی غالب آ جائے تو اس کا نتیجہ، فساد اور تخریب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ افلاطون کے نزدیک، عدل اور ہوسِ اقتدار دو متضاد نقاط ہیں جو کبھی یک جا نہیں ہو سکتے۔

The Myth Of The State. p.74-75

اور جب اس ہوسِ اقتدار کو "مفادِ مملکت" کے مقدس نقاب میں چھپا دیا جائے تو ان ہوس پرستوں کے دل میں ضمیر کی ملامت کی وہ خلش بھی باقی نہیں رہتی جو برہنہ استبداد کی صورت میں اکثر ابھر آتی ہے۔ آپ دوسرے انسانوں کو اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین کا سامان بنا لیجئے اور اس طرح ان پر تشدد کیجئے تو اگر آپ کا اپنا ضمیر مردہ بھی ہو چکا ہو تو کم از کم، دوسرے لوگ اس کے خلاف آواز اٹھائیں گے۔ لیکن جب یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ایسا کرنا مملکت کے مفاد کا تقاضا ہے' تو نہ صرف یہ کہ اس کی مخالفت کہیں سے نہیں ہوگی بلکہ عام طور پر اس کی تائید ہوگی۔ اور آپ کو محبِ وطن اور بہی خواہِ مملکت کا سارٹیفکیٹ بھی مل جائے گا۔ اور تماشہ یہ کہ کوئی شخص آپ سے یہ نہیں پوچھے گا کہ ایسا کرنا واقعی مملکت کے مفاد کا تقاضا ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی آواز اٹھائے تو اسے یہ کہہ کر دبا دیا جاتا ہے کہ اس راز کا انکشاف مفادِ مملکت کے خلاف ہے۔ حالانکہ جیسے کہ پہلے کہا جا چکا ہے، مملکت کا وجود ہی موہوم ہوتا ہے۔ اگر اس فریبِ تخیل کو مٹا کر بات صاف کی جائے تو انسانوں کے اجتماعی نظام کا مقصود و معیار' افراد کا مفاد قرار پا جائے گا۔ یہ معیار ایسا محسوس ہے جس میں نہ کسی کو دھوکا دیا جا سکتا ہے' نہ کوئی دھوکا کھا سکتا ہے۔ لیکن مملکت کا نظریہ عجیب طرفہ تماشہ ہے۔ اس میں مملکت خوشحال (Prosperous) ہوتی جاتی ہے اور افراد مفلوک۔ مملکت طاقتور ہوتی جاتی ہے اور افراد کمزور اور ناتواں۔ مملکت کی دولت بڑھتی جاتی ہے اور افراد غریب سے غریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ (ارسطو کی فریب انگیز تشبیہ کے مطابق) اعضاء سوکھ کر کانٹا ہوتے جاتے ہیں لیکن جسم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ تنومند اور توانا ہو رہا ہے۔ انہیں ایک ایک کر کے کچل یا کاٹ دیا جاتا ہے اور سمجھا یا یہ جاتا ہے کہ اس سے جسم کی نشو و نما ہو رہی ہے۔ یہ نشو و نما، مرفہ الحالی، تنومندی، توانائی، درحقیقت ان چند افراد کی ہوتی ہے جن کے ہاتھ میں اقتدار ہوتا ہے۔ (جیسا کہ بتایا جا چکا ہے) "مملکت" درحقیقت انہی کا نام ہوتا ہے۔ اس کا الگ وجود ہی نہیں ہوتا۔ اگر آپ نے اس "عنقا" کا وجود تسلیم ہی کرنا ہے تو اس حقیقت کو خود بھی تسلیم کیجئے اور دوسروں سے بھی تسلیم کرائیے کہ مملکت کی مرفہ الحالی اور ضعف و ناتوانی کے ماپنے اور پرکھنے کا معیار افرادِ مملکت ہیں۔ اگر افراد خوشحال، تنومند و توانا اور بے خوف و خطر ہیں تو مملکت بھی خوشحال اور طاقتور ہے اگر افراد سقیم الحال اور ہر وقت خوف و حزن کے احساس کا شکار ہیں' تو مملکت سوختہ بخت اور بدحال ہے۔ جب اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

تو اس سے اس کی یہی مراد تھی۔

(o)

تصریحاتِ بالا سے ہم نے دیکھ لیا کہ انسان کی ہوسِ اقتدار نے مملکت کا موہوم بت تراش کر استبداد کی کتنی راہیں کشادہ کر لیں اور انہیں کس طرح حق بجانب قرار دے لیا۔ انسانیت کا کتنا قیمتی خون ہے جو اس کالی دیوی کے استھان پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ بنی آدم کی کس قدر سوختنی قربانیاں ہیں جن سے اس بھیروں ماتا کی خوئے درندگی (Sadistic nature) کی تسکین کا سامان فراہم کیا جاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ تھیاکریسی میں جو کچھ اربابِ کلیسا خدا کے نام سے کرتے تھے، سیکولرازم میں وہی کچھ مملکت کے نام سے کیا جاتا ہے۔ نہ اُس میں کوئی خدا سے پوچھ سکتا تھا کہ ہمارے ساتھ جو آپ کے نام پر کیا جاتا ہے کیا وہ واقعی آپ کا مطالبہ ہے۔ نہ ہی کوئی مملکت کی دیوی سے دریافت کر سکتا ہے کہ جن قربانیوں کا تقاضا ہم سے کیا جاتا ہے کیا وہ آپ ہی کا ارشاد ہے؟ تھیاکریسی کا خدا بھی محض ذہنی اور خیالی تھا۔ مملکت کا معبود بھی محض ذہنی اور خیالی۔ وہ بھی "پجاریوں" کا وضع کردہ نقابِ فریب پرور، یہ بھی "مہاجنوں" کا بُنا ہوا پردۂ سحر انگیز۔ فرق دونوں میں صرف اتنا ہے کہ وہ (دورِ جہالت کی) کھڈیوں کا بُنا ہوا تھا اس لئے (Coarse) اور (Thread-bare) تھا۔ یہ تہذیبِ حاضر کی مشینوں کا ساختہ پرداختہ ہے اس لئے ایسا نفیس و لطیف کہ اس کے پیچھے چھپے ہوئے فریب کی طرف کسی کی نگاہ نہیں جاتی۔

قرآن کا پیغامِ حقیقت کشا

قرآن آیا اور اس نے ذہنِ انسانی کے تراشیدہ تمام بتوں کو حریمِ انسانیت سے نکال باہر کیا۔ قرآن ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا پورا نظام سامنے لاتا ہے لیکن آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ اس میں مملکت کا لفظ تک نہیں ملتا۔ اس نے اس ہیئتِ اجتماعیہ کے دو ہی اجزاء بتائے ہیں — ایک، ملک یعنی ایک خطۂ ارض اور دوسرا جزو، اس ملک میں بسنے والے انسان۔ ملک کا تعین بھی وہ اپنے پروگرام کے ابتدائے کار کے لئے کرتا ہے۔ یعنی وہ اپنے پروگرام کا آغاز ایک خطۂ ارض سے کرتا ہے اور یہی اس کا ممکن العمل اور آسان طریقہ ہے ورنہ اس کے سامنے اس پروگرام کے منتہیٰ کے طور پر پورے کا پورا کرۂ ارض ہوتا ہے۔ وہ ساری دنیا میں اس نظام کو پھیلا دینا چاہتا ہے۔ وہ اس خطۂ ارض کو (جس نے اس کے پروگرام کی اولین تجربہ گاہ بننا ہے) محفوظ رکھنے کی تاکید کرتا ہے کہ جب تک یہ محفوظ نہیں ہوگا، اس تجربہ پر امن و سکون سے عمل نہیں ہو سکے گا۔ وہ اس کی بھی تاکید کرتا ہے کہ اس خطہ (ملک) کی آفاتِ ارضی و سماوی سے حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ وہ جب بتاتا ہے کہ اقوامِ گذشتہ کے مساکن کس طرح سیلابوں، آندھیوں، زلزلوں، آتش فشاں پہاڑوں یا پانی کے بندوں (Dams) وغیرہ کی شکست و ریخت سے تباہ ہو گئے تو اس سے یہی کہنا مقصود ہے کہ تم اپنے ملک کو اس قسم کے حوادث سے محفوظ رکھنا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بیرونی خطرات سے حفاظت کی تاکید یہ کہہ کر کرتا ہے کہ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (۸/۶۰) تم اپنے ملک کی سرحدوں کو امکان بھر مضبوط رکھو۔ ایسا مضبوط کہ تمہارے اور تمہارے دین کے دشمن اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہ کر سکیں — وہ دشمن بھی جو تمہاری نگاہوں کے سامنے ہیں اور وہ بھی جو سردست تمہاری نظروں سے اوجھل ہیں۔ اس مقصد کے لئے تم جو کچھ بھی صرف کرو گے وہ تمہارے ہاتھ سے جاتا نہیں رہے گا لوٹ کر واپس آ جائے گا۔ اس میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں ہوگی۔ مملکت ایک موہوم تصور تھا۔ اس کے مقابلہ میں ملک ایک محسوس

خطۂ زمین کا نام ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ملک خطرہ میں ہے تو اس خطرہ کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے متعلق نہ کوئی دھوکا دے سکتا ہے، نہ دھوکا کھایا جا سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس خطرہ کی نوعیت یا کمیت کا اُن معلومات کی بنا پر لگایا جا سکتا ہے جو کسی کو حاصل ہوں۔ لیکن اس کا تعلق بہرحال محسوسات سے ہوتا ہے۔ مملکت کی طرح موہوم نہیں ہوتا۔

مقصود بالذات کون ہے

لیکن ملک کی حفاظت کی اس قدر تاکید کے باوجود قرآن کریم اسے کبھی مقصود بالذات قرار نہیں دیتا بلکہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اسی طرح، جیسے ایک مکان (گھر) کا وجود مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ وہ افرادِ خانہ کے لئے رہائش گاہ ہوتا ہے۔ اگر مکان میں مکین نہ ہوں تو وہ ویرانہ بن جاتا ہے۔ مقصود بالذات مکان نہیں، مکان کے مکین ہوتے ہیں۔ مکان، اس کے مکینوں کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ مکان مضبوط ہوتا ہے تو اس سے مکان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس کے مکین محفوظ اور مطمئن ہوتے ہیں۔ مکان گرتا ہے تو اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ خانماں خراب اس کے مکین ہوتے ہیں۔ قرآن کے نزدیک، مقصود بالذات، نہ مملکت ہے، نہ ملک۔ مقصود بالذات افراد ہیں۔ حتیٰ کہ اس کے نزدیک خارج کائنات کا وجود بھی مقصود بالذات نہیں۔ یہ سب انسان کے فائدے کے لئے ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ (۲/۲۹) کرۂ ارض میں جو کچھ ہے، اُسے خدا نے تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔ صرف ارض ہی میں نہیں۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (۴۵/۱۳) ارض و سموات میں جو کچھ ہے، سب کا سب، خدا نے تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

اور یہ کہ ؎

ہے گرمیِ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم — سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی

یہ تو رہا انسان اور کائنات کا تعلق۔ لیکن ہمارے موضوعِ زیرِ نظر کی رُو سے، سوال انسان اور انسان کے باہمی تعلق کا ہے۔ یہی وہ انسانوں کا باہمی تعلق ہے جس سے تہذیب، تمدن، معاشرت، سیاست، کے تصورات جنم لیتے اور مختلف نظام اور ضوابط وجود میں آتے ہیں۔ میں نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ قرآن کریم میں مملکت کا نام تک نہیں آیا۔ ملک کا تصور ضرور دیا گیا ہے اور ملک کے اندر حکومت کا تصور بھی۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جس چیز کو ہم نے مملکت کے نظریہ کی خرابی کہا ہے وہ درحقیقت نظامِ اقتدار کی خرابی ہے۔ قرآن نے نظامِ اقتدار کو حکومت کہہ کر پکارا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نظامِ اقتدار یا نظامِ حکومت کا کس قسم کا تصور دیتا ہے اور اس میں فرد کی حیثیت اور مقام کیا متعین ہوتا ہے۔

نظامِ حکومت کا قرآنی تصور

دنیا کا کوئی نظامِ حکومت بھی لیجئے، اس میں کسی نہ کسی شکل میں بعض انسانوں کا دوسرے انسانوں پر اقتدار ضرور قائم رہتا ہے۔ قرآن کریم اس تصور کو وجہ تذلیلِ انسانیت قرار دیتا ہے کہ کسی انسان کا کسی دوسرے انسان پر اقتدار ہو۔ وہ اسے مساواتِ انسانیہ کے خلاف اور احترامِ آدمیت کے منافی ٹھہراتا ہے۔ وہ انسانوں کی انسانوں پر حکومت کے تصور کو باطل قرار دیتا ہے کیونکہ اس سے فرد اُس آزادی سے محروم ہو جاتا ہے جو اُسے انسان ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے۔

لیکن نظامِ حکومت کے بغیر تو مدنی الطبع انسان کا معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اس سے یہ سوال سامنے آئے گا کہ قرآن اُس مسئلہ کا حل کیا بتاتا ہے۔ وہ اس کا حل یہ بتاتا ہے کہ انسانوں پر حقِ حکومت کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو حاصل نہیں۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس سے ذہن فوراً اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ اس طرح تو پھر پھرا کر ہم پھر وہیں جا پہنچے جہاں ہم تھیاکریسی یا مملکتی تصور میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہاں بھی حقِ حکومت ان قوتوں کا بتایا جاتا تھا جن کا تعلق عالمِ محسوسات سے نہیں۔ یہاں بھی انسانوں کو اس ہستی کے زیرِ اقتدار لایا جاتا ہے جسے وہ نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ اس کی بات سن سکتے ہیں، نہ اس سے کچھ کہہ سکتے ہیں، نہ یہ پوچھ سکتے ہیں کہ جو کچھ ہم سے کہا جاتا ہے کیا وہ آپ کا ارشاد ہے، اور جو کچھ ہم سے مانگا جاتا ہے، کیا وہ آپ ہی کا مطالبہ ہے؟ یہ سوال بڑا معقول ہے، لیکن اس کا جواب معقول تر۔ وہ کہتا ہے کہ اس نظامِ حکومت میں بے شک تمہارا تعلق ایک غیر محسوس غیر مرئی ہستی (خدا) سے ہوتا ہے لیکن اُس نے اپنے نظامِ حکومت کے لئے ایک ضابطۂ قوانین و اقتدار دے دیا ہے جو محسوس بھی ہے اور مرئی بھی۔ اُسے تم دیکھ سکتے ہو، پڑھ سکتے ہو، سمجھ سکتے ہو۔ خدا کی حکومت سے مراد اس ضابطہ، قوانین و اقتدار کی اطاعت ہے۔ یہ ضابطہ مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ اس لئے اس میں نہ کوئی مذہبی پیشوائیت کسی قسم کا حک و اضافہ کر سکتی ہے، نہ کوئی سیاسی اعتبار سے ذی اقتدار، کسی قسم کا تغیر و تبدل۔ خدا نے اور تو اور خود رسول اللہ سے بھی کہہ دیا کہ — فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ۔ (۵/۴۸) ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کر دو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہ اس بات کا اعلان کر دو کہ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي (۱۰/۱۵) مجھے اس کا کوئی اختیار نہیں کہ میں اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکوں۔" کتنا بڑا ہے اطمینان جو اس طرح افراد معاشرہ (بلکہ نوعِ انسانی) کو حاصل ہو گیا کہ ہم پر حکومت صرف اس کتاب کی ہو گی۔ حکم صرف اس کا چلے گا۔ اس سے ہٹ کر کوئی ہم سے کسی قسم کا حکم منوانے کا اختیار و اقتدار نہیں رکھے گا۔ حتیٰ کہ جو ہم سے اس کے قوانین کی اطاعت کرائے گا وہ پہلے خود اس کی اطاعت کرے گا۔ اس اعتبار سے نہ کوئی حاکم ہو گا نہ محکوم۔

ختمِ نبوت بطور منشورِ آزادی

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ یہ اطمینان (کہ ہم سے کوئی شخص اپنا حکم نہیں منوا سکے گا۔ فرماں پذیری صرف

اس کتاب کی ہوگی، حضور نبی اکرمؐ کے زمانہ کے انسانوں ہی کو حاصل نہیں تھا۔ یہ اطمینان قیامت تک آنے والی انسانیت کو یکساں طور پر حاصل ہوگا۔ وہ اس طرح کہ اس کتاب کی تکمیل کے بعد اعلان کر دیا کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب قیامت تک کوئی شخص آکر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ تمہارے خدا نے یہ حکم دیا ہے، تم پر اس کی اطاعت لازم ہے۔ خدا نے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ اپنی اس کتاب میں کہہ دیا ہے۔ اس کے بعد خدا نہ کچھ اور کہے گا، نہ اس میں تغیر و تبدل کرے گا۔ یہ ہماری بدقسمتی تھی، عزیزانِ من! (اور میں کہوں گا کہ اسلام کے خلاف بہت بڑی سازش) کہ ختمِ نبوت کو محض ایک اعتقادی مسئلہ بنا دیا گیا، ورنہ، یہ تمام نوعِ انسان کیلئے قیامت تک ایسا منشورِ آزادی تھا جو ہر نوعِ غلامی کے لئے پیغامِ موت تھا۔ سوچئے کہ یہ کتنا بڑا عظیم اعلان تھا کہ جو انسان، گروہ یا قوم انسانوں کی محکومی سے نجات حاصل کرنا چاہے، وہ اس کتاب کو دیکھ لے۔ سمجھ لے۔ اس کی آزادی پر صرف وہی پابندیاں عاید کی جا سکیں گی جن کا تعین اس کتاب میں کر دیا گیا ہے۔ اب کوئی شخص آ کر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میں تو ایک طرف، خدا نے بھی تم پر یہ مزید پابندیاں عاید کر دی ہیں، یا ان پابندیوں میں کوئی تغیر و تبدل کر دیا ہے۔ یہ تھا عالمگیر، ابدی منشورِ آزادی جسے ختمِ نبوت نے تمام نوعِ انسان کو عطا کیا تھا۔ یعنی یہ ضمانت کہ اب کسی شخص یا گروہ کو کسی ایسی بات کے منوانے یا کوئی ایسی پابندی عاید کرنے کا حق اور اختیار حاصل نہیں ہوگا جو اس کتاب میں نہیں، خواہ وہ مملکت کے نام پر ہو یا خود خدا کے نام پر۔ اس سے بڑی آزادی کا تصور بھی کیا جا سکتا تھا، یا کیا جا سکتا ہے؟

ان پابندیوں کا مقصد

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کتاب اللہ میں جو حدود مقرر یا جو پابندیاں عاید کی گئی ہیں ان سے مقصد کیا ہے؟ انسانوں کی طرف سے جو پابندیاں دوسرے انسانوں پر عاید کی جاتی ہیں، اس سے مقصد ان لوگوں کے اختیارات کو کم یا محدود کرنا ہوتا ہے جن پر وہ پابندیاں عاید کی جاتی ہیں۔ یعنی ان کی آزادی کو محدود یا سلب کرنا۔ لیکن قرآن یہ کہتا ہے کہ جو پابندیاں خدا کی طرف سے عاید کی جاتی ہیں ان سے یہ مقصد نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس لا یکلف اللہ نفسًا الا وسعھا (۲/۲۸۶) خدا کی طرف سے عاید کردہ پابندیوں سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسانی ذات میں مزید وسعتیں پیدا ہوں۔ پابندی سے انسانی ذات کی مضمر صلاحیتوں میں وسعت پیدا ہوتا ایک ایسا نفسیاتی طریقِ عمل ہے جس کی پردہ کشائی (اور وہ بھی صرف ایک حد تک) عصرِ حاضر میں علم النفس (Psychology) کی رو سے ہو سکی ہے۔ اس سے پہلے یہ بات بہت کم سمجھ میں آتی تھی۔ ماہرینِ علم النفس بتاتے ہیں کہ انسانی ذات کی جو توانائی کسی تخریبی مقصد کے لئے بروئے کار آ رہی ہو، اس کے راستے میں روک، کھڑی کر کے، اس کا رُخ بدل دیا جائے تو وہ دگنی شدت سے تعمیری مقاصد میں مصروف ہو جاتی ہے۔ اس طریقِ عمل کو ان کی اصطلاح میں (Sublimation) کہا جاتا ہے۔ قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیا تھا کہ انسانی ذات پر جو پابندیاں عاید کی گئی ہیں، ان سے مقصد یہ ہے کہ عملِ تبدیلیِ رخ (Sublimation) سے انسانی ذات کی وسعتوں میں اضافہ کر دیا

جائے۔ لا یکلف اللہ نفسًا الا وسعھا (۲/۲۸۶) عام سطح پر اسے یوں سمجھئے کہ نہر کے پانی کی روانی میں سستی واقع ہو جائے تو وہاں پتھروں کی ٹھوکر (FALL) بنا دی جاتی ہے۔ اس سے مقصد نہر کی روانی میں رکاوٹ پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ جب نہر اس ٹھوکر سے ٹکراتی ہے تو اس کی روانی میں کہیں زیادہ تیزی آجاتی ہے۔ یہ ہے مقصد کتاب اللہ کی رو سے عاید کردہ پابندیوں کا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ رسول اللہ سے کہا گیا تھا کہ آپ کتاب اللہ کے مطابق نظامِ حکومت قائم کریں۔ اس کا ایک مقصد تو یہ بتایا گیا کہ یضع عنھم اصرھم و الاغلال التی کانت علیھم (۷/۱۵۷)۔ اس سے نوعِ انسانی کے سر پر سے وہ بھاری بھرکم سلیں اتر جائیں گی جن کے نیچے وہ دبی چلی آرہی تھی۔ اس سے انسانیت غلامی کی ان زنجیروں سے آزاد ہو جائے گی جن میں وہ جکڑی ہوئی تھی۔ یہ مقصد بجائے خویش بڑا عظیم ہے لیکن پھر بھی یہ منفیانہ مقصد ہے۔ قرآن ان سلوں کے نیچے دبی ہوئی اور ان زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو ان سے رہائی دلا کر مثبت قدم اٹھاتا ہے اور رسول اللہ کا دوسرا مقصد یہ بتاتا ہے کہ ویزکیھم (۶۲/۲) وہ افرادِ انسانیہ کی ذات کی نشو و نما کا انتظام کرتا ہے۔ یہ فریضہ رسول اللہ کی ذات تک محدود نہیں تھا بلکہ اس نظام کا مقصد تھا جسے کتاب اللہ کی عملی تنفیذ کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اس جماعت کے متعلق جو اس نظام کے قیام کی ذمہ دار تھی، کہا گیا کہ الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ۔ (۲۲/۴۱)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ملک کا اقتدار ان کے ہاتھ میں آئے گا تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے اور "زکوٰۃ دیں گے"۔ وقت نہیں کہ میں اسلامی نظامِ حکومت کے اس پروگرام کی تشریح و تفصیل سامنے لاسکوں جسے اس مختصر سی آیت میں اس جامعیت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اس وقت میں اس کے صرف اس گوشے کی وضاحت کروں گا جس کا تعلق موضوعِ زیرِ نظر سے ہے۔ یعنی فرد کی انفرادیت کی وسعت۔ اس کی ذات کی نشو و نما۔ ہمارے ہاں "زکوٰۃ" سے عام مفہوم، اپنے مال میں سے، سال کے بعد کچھ رقم خدا کی راہ میں دے دینا ہے لیکن اس اصطلاح کا قرآنی مفہوم اس سے کہیں وسیع ہے۔ یہاں کہا یہ گیا ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت کا فریضہ "ایتائے زکوٰۃ" ہے۔ زکوٰۃ لینا یا وصول کرنا نہیں۔ زکوٰۃ دینا۔ زکوٰۃ کے لفظی معنی ہیں بڑھنا، پھولنا، پھلنا، یا نشو و نما۔ "ایتائے زکوٰۃ" سے مراد یہ ہے کہ اسلامی نظام کا فریضہ یہ ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشو و نما مہیا کرے۔ "نشو و نما" میں انسان کی طبیعی نشو و نما بھی داخل ہے اور اس کی ذات کی نشو و نما بھی۔ جہاں تک طبیعی یا جسمانی نشو و نما کا تعلق ہے، اس کے متعلق میں نے، قرآن کے معاشی نظام کے سلسلہ میں، گذشتہ پچیس سال میں بہت کچھ کہا اور بہت کچھ لکھا ہے۔ اس وقت میں اس کے ماحصل کو حضور نبی اکرم کے اس ارشادِ گرامی میں پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں جس میں آپ نے فرمایا کہ

> جس بستی میں کسی شخص نے اس طرح رات بسر کی کہ وہ بھوکا سویا، اس بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔

اور جس کی ذمہ داری کو حضرت عمرؓ نے اپنے ان مشہور الفاظ میں دہرایا کہ

> اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر گیا تو ستم ہے اس ذات کی

جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

یہ ہے اسلامی نظام کے فریضۂ "ایتائے زکوٰۃ" کا وہ گوشہ جس کا تعلق افراد کی طبیعی ضروریات پورا کرنے سے ہے۔ جہاں تک ان کی ذات کی صلاحیتوں کی نشو و نما کا تعلق ہے، اس نظام کا منتہیٰ اور مقصود ہی یہ ہے۔ اس کی پہلی شق یہ ہے کہ وہ نظام ایسا ماحول اور ایسی فضا پیدا کرے جس میں لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون (۲/۶۲) کی کیفیت ہو۔ یعنی جس میں افراد معاشرہ کو نہ بیرونی خطرات کا خوف ہو نہ ہی ان کی داخلی دنیا میں کسی قسم کا حزن و ملال۔ سوچئے عزیزانِ من! کہ اس نظام کا صرف یہ ایک گوشہ انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے کتنی محکم بنیاد بن جاتا ہے۔ اس کے بعد اس نظام کا وہ فریضہ ہے جسے حضور نبی اکرمؐ کے حوالہ سے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ یعلمھم الکتاب والحکمۃ (۲/۶۲)۔ وہ ان کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کرتا ہے جس سے وہ ایک طرف قانون کی غرض و غایت اور مطلوب و مقصود سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اور دوسری طرف ان کے فہم و فراست اور عقل و فکر کو اس قدر جلا بخشتا ہے کہ ان کی نگاہیں رموز و اسرارِ کائنات کی گہرائیوں تک پہنچ جاتی ہیں پھر" تزکیھم "کے" تطھرھم"۔ (۹/۱۰۳) وہ ان کی انسانی صلاحیتوں کو نشو و نما ہی نہیں دیتا بلکہ ان نشو و نما یافتہ صلاحیتوں کو اقدار خداوندی کے مطابق صرف کرنا بھی سکھاتا ہے۔ اس سے انسانی سیرت میں پاکیزگی اور کردار میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ اسے عمل تطہیر کہا گیا ہے۔

(۰)

مقصود و منتہیٰ

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن کریم کی رُو سے، آسمانی سلسلہ رشد و ہدایت کا نظام۔ بعثت حضرات انبیاء کرامؑ۔ ضابطہ قوانین خداوندی کا نزول — حدود اور پابندیوں کا تعین۔ خدا کی آخری کتاب کا مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ہونا جس کا منطقی نتیجہ ختم نبوت ہے، ان سب کا منتہیٰ و مقصود افراد انسانیہ کو ہر نوع کی غلامی سے نجات دلا کر ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما اور ان نشو و نما یافتہ صلاحیتوں کا اقدار خداوندی کے مطابق صرف و استعمال ہے جسے سیرت کی پاکیزگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں مزید غور و تعمق سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ فرد کی نشو و نما اور تطہیر بھی اس سلسلۂ عمل کی آخری کڑی نہیں۔ اس کی اگلی کڑی یہ ہے کہ اس قسم کے افراد پر مشتمل ایک ایسی جماعت، ایک ایسی امت وجود میں آئے جس کا نصب العین نوع انسان کی خیر و بہبود ہو۔ اس امت کے متعلق کہا گیا ہے کہ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس (۳/۱۱۰) تم وہ صاحب خیر امت ہو جسے نوع انسان کی بہبود کے لئے متشکل کیا گیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قرآن کریم نے فرد سے کہا ہے کہ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔ (۸۹/۲۹-۳۰) تم جنت میں جانا چاہتے ہو تو میرے بندوں کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ اس ایک حکم نے تصوف کے تصور رہبانیت کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ جنت، خانقاہوں کی تجرد گاہوں اور درویش خانوں کی خلوتوں میں حاصل نہیں

ہوسکتی۔ یہ اجتماعی زندگی کی جلوتوں سے حاصل ہوتی ہے ۔۔ بالفاظِ دیگر، فرد، جماعت یا امت کا جزو، اور جماعت یا امت کا فریضہ عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہے۔ انسانیت کی بہبود" کے لئے بھی قرآن "مفادِ مملکت" یا پبلک انٹرسٹ" جیسی مبہم اصطلاحات استعمال نہیں کرتا۔ وہ واضح اور متعین الفاظ میں کہتا ہے کہ ۔۔ وَ یمکث فی الارض ما ینفع الناس (۱۳/۱۷) یاد رکھو! بقا اور دوام صرف اس عمل کے لئے ہے جو نوعِ انسان کی منفعت کے لئے ہو۔

(۰)

فرد اور جماعت کا تعلق

فرد اور مملکت کے باہمی تعلق کے سلسلہ میں جو کچھ میں نے اپنی بصیرت کے مطابق قرآن مجید سے سمجھا ہے اُسے پیش خدمت کر دیا ہے۔ لیکن ہمارے زمانے میں ایک اور اصطلاح وجود میں آئی ہے اور وہ ہے نظریۂ اجتماعیت (Collectivism)۔ یہ نظریہ نہ نیا ہے نہ منفرد۔ یہ درحقیقت ہیگل کے نظریۂ مملکت ہی کا بدلا ہوا نام ہے۔ اس نظریہ کی رُو سے کہا جاتا ہے کہ وجود صرف سوسائٹی یا پارٹی (جماعت) کا ہے، فرد کا نہیں۔ نظریۂ اجتماعیت کے اس مفہوم کے پیش نظر، جو کچھ نظریۂ مملکت کے بارے میں کہا جا چکا ہے اس سے الگ یا زائد کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، لیکن چونکہ قرآن کریم جماعتی زندگی پر بڑا زور دیتا ہے اور نظریہ اجتماعیت کے مدعی، اسے اپنے نظریہ کی تائید میں پیش کر کے اسے عین مطابق اسلام قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں، اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ مختصر الفاظ میں اس الحاد کو بھی دور کر دیا جائے۔ ان میں سے بعض کو یہ کہتے بھی سنا گیا ہے کہ اقبال کا نظریہ بھی یہی تھا۔ یہ ستم ظریفی اور اقبال پر انتہائی ظلم ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اقبال "فلسفۂ خودی" کا علمبردار ہے اور "خودی" انفرادیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ اقبالؒ کے سارے پیغام کا ماحصل، فرد کی انفرادیت کی نشوونما اور حفظ و بقا ہے۔ وہ انسانی ذات کو اس قدر اہمیت دیتا ہے کہ مملکت یا جماعت تو ایک طرف، وہ اسے ذاتِ خداوندی میں بھی جذب و فنا ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ اس کا منفرد وجود وہاں بھی باقی رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی تعلیم و تلقین یہ ہے کہ،

بخود محکم گذار اندر حضورش
مشو ناپید اندر بحرِ نورش

وہ اس باب میں اس قدر "خود نگر و خودگر و خودگیر" ہے کہ اپنی انفرادیت کا ختم کرنا تو ایک طرف، اگر اس میں ذرا سی بھی کمی آجائے تو وہ اس قیمت پر حیاتِ جاوداں خریدنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا چنانچہ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) وہ کہتا ہے۔

اگر یک ذرہ کم گردد ز انگیزِ وجودِ من باین قیمت نمی گیرم حیاتِ جاودانی را

لیکن (جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں) وہ کہتا ہے کہ فرد کی انفرادیت (یا خودی) تصوف کی خلوت گاہوں میں مستحکم نہیں ہوتی، جماعت کے ساتھ رہتے ہوئے نشوونما پاتی اور استحکام پذیر ہوتی ہے۔ وہ رموزِ بیخودی میں

کہتے ہیں.

فرد را ربطِ جماعت رحمت است　　جوہرِ او را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش　　رونقِ ہنگامۂ احرار باش

یعنی فرد جماعت کے ساتھ صرف ربط رکھتا ہے۔ اس میں جذب اور فنا نہیں ہو جاتا۔ وہ اس حقیقت کو تشبیہاتی انداز میں یوں بیان کرتے ہیں کہ۔

فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند　　سلک و گوہر کہکشان و اختراند
فرد می گیرد ز ملت احترام　　ملت از افراد می یابد نظام

ملت افراد سے الگ کوئی شے نہیں۔ وہ انہی کے ربطِ باہمی سے وجود پذیر ہوتی ہے۔

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

اور :۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر　　ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

جب افراد کا نصب العین واحد ہو جائے، جب ان میں یک رنگی اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے، تو انہیں ملت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس حقیقت کو وہ جاوید نامہ میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

چیست ملت؟ ایک گوئی لا الٰہ　　با ہزاراں چشم بودن یک نگہ

میں نے کلامِ اقبالؒ سے یہ چند اشعار مثالاً پیش کر دیئے ہیں ورنہ ان کا سارا کلام کسی نہ کسی نوعیت سے ان کے فلسفۂ خودی (انفرادیت) ہی کی تفسیر ہے۔ بعض مقامات پر البتہ وہ غلط تشبیہ استعمال کر گئے ہیں جس سے عصرِ حاضر کے نظریۂ اجتماعیت کی تائید ہو جاتی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

"موج اور دریا" کی تشبیہ بڑی مغالطہ آفریں ہے ــــ ارسطو کی تشبیہ اعضا اور جسم سے بھی زیادہ مغالطہ آفریں۔ اس تشبیہ کی رو سے فرد کا انفعی کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ وجودِ جماعت ہی کا ثابت ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے، یہ تشبیہ کی غلطی ہے اور شاعری میں ایسا ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ کی پیش کردہ صحیح تشبیہ اس شعر میں ملتی ہے جو میرے نزدیک بڑا حقیقت کشا اور بصیرت افروز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ۔

زندگی انجمن آرا ز نگہدارِ خود است
ایکہ در قافلۂ با ہمہ رو بے ہمہ شو

افرادِ کارواں اور کاروان (قافلہ) کی تشبیہ برجستہ ہے۔ قافلہ، افرادِ قافلہ سے الگ اپنا وجود نہیں رکھتا۔ وہ افرادِ قافلہ ہی کے ربطِ باہمی سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ البتہ افرادِ قافلہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ قافلہ کے ساتھ رہیں تاکہ وہ سفر کے خطرات سے محفوظ و مصئون منزل تک پہنچ جائیں قرآن کریم

فرد اور جماعت میں یہی تعلق قائم کرتا ہے جب کہتا ہے کہ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۳/۱۹۹)

اے افرادِ جماعتِ مومنین! تم خود بھی استقامت پذیر رہو اور دوسروں کی استقامت پذیری کا بھی موجب بنو، اور بانہوں میں بانہیں ڈالے، قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے، جانبِ منزل رواں دواں رہو۔ یہی کامیابی کا طریق ہے۔

یہ ہے فرد اور جماعت کا باہمی تعلق۔ یعنی افراد کا ربط باہمی جو ان کی تقویت کا موجب بنتا ہے۔ اس میں نہ تصوف کی فنائے ذات ہے، جس میں "عشرتِ قطرہ' دریا میں فنا ہو جانا" ہوتا ہے اور نہ ہی عصرِ حاضر کا نظامِ مملکت یا نظریہ اجتماعیت، جس میں مقصود بالذات مملکت یا اجتماعیت کا وجود ہوتا ہے، اور افراد محض ان کے وجود کو قائم رکھنے کا ذریعہ۔ قرآن کا پیامِ حیات بخش، ان تمام نظریات کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ اس نے فرد کی انفرادیت کو دو لفظوں میں اس قدر جامعیت سے سمو کر رکھ دیا ہے کہ نگہ بصیرت اس سے وجد میں آجاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جماعتی زندگی بجا اور درست۔ لیکن۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ ۔ (۶/۹۵)

تم ہمارے حضور فرد کی حیثیت ہی سے آؤ گے۔ اور فرد کی حیثیت ہی سے تم سے تمہارے افکار و کردار کے متعلق بازپرس ہو گی۔ یہی خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کا نقطہ ماسکہ ہے۔ افراد دین کے متعین کردہ مقصد کو منظم حیثیت سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی اس تنظیمی ہیئت کا نام جماعت یا امت ہے۔ یہ مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ کلمۃ اللہ ھی العلیا ۔ (۹/۴۰) تاکہ دنیا میں انسانوں کا وضع کردہ نظام نہیں، خدا کا متعین کردہ نظام غالب رہے۔ دنیا نے مختلف نظامہائے حیات کو آزما کر دیکھ لیا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ان کے لئے وجہ تسکین نہیں بن سکا۔ اب وہ ہار تھک کر، ایک ایسے نظام کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو انہیں "مصرعہ موزوں" کی شکل میں تو کہیں نظر نہیں آتا لیکن ان کے فکر کی خمیر میں پہلو بدل رہا ہے ـــ (Erich Fromm) کو اس کی جھلک کچھ اس طرح دکھائی دیتی ہے۔

وہ نظام یا معاشرہ جس میں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کے مقاصد کے حصول کا آلۂ کار نہیں وہ (فرد) بلا استثنا اور بلا مشروط، خود اپنا مقصود آپ ہے۔ اس معاشرہ میں کسی فرد کو کسی ایسے مقصد کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا، نہ ہی وہ خود اپنے آپ کو کسی ایسے مقصد کے لئے استعمال کرتا ہے جو اس کی انسانی صلاحیتوں کے مشہود کرنے کے لئے نہ ہو۔ وہ معاشرہ جس میں مرکزی حیثیت فرد کو حاصل ہو اور اس کی تمام اقتصادی اور سیاسی سرگرمیوں کا محور ذاتی نشوونما ہو۔ اس معاشرہ میں طمع، ہوس، استحصال جیسے جذبات کا مقصد نہ تو مادی مفاد میں اضافہ کا موجب ہو اور نہ ہی کسی کے ایغو کی تسکین کا باعث جس میں ہر فرد اپنی آزاد ضمیر کے مطابق کام کرے اور اس کے ایسا کرنے کو اس کا بنیادی حق تسلیم کیا جائے جس میں موافقت پرستی اور اصول شکنی کو خلافت

تقاضائے معاشرت تصور کیا جائے جس میں فرد معاشرتی امور میں اس طرح دلچسپی لے کہ وہ اس کے ذاتی معاملات بن جائیں جس میں دوسرے انسانوں کے ساتھ اُس کے تعلقات ایسے ہی ہوں جیسے اپنے گھر کے افراد کے ساتھ ہوتے ہیں۔ جس میں ایک فرد ایسا آزاد ہو کہ وہ علیٰ قدرِ وسعت و امکان سرگرمِ عمل رہے اور معاشرہ کی زندگی میں ایک ذمہ دار معاون قرار پائے ۔ معاشرہ کی زندگی میں بھی اور خود اپنی زندگی میں بھی ۔ وہ جو نوعِ انسان کی وحدت اور استحکام میں اضافہ کا موجب ہو اور افراد معاشرہ کو نہ صرف اس کی اجازت دے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرے کہ وہ باہمدگر محبت اور اخوت سے رہیں ۔ یہ معاشرہ، ہر فرد کی تخلیقی سرگرمیوں میں اس کا ممد و معاون ہو، عقل و بصیرت کے دروازے اس پر کھولے اور ہر فرد کو اس قابل بنا دے کہ وہ اپنے داخلی جذبات کا اجتماعی آرٹ اور رسوم کی شکل میں اظہار کر سکے۔ (P. 241-42)

یہ مفکر اس قسم کے معاشرہ کو (Sane Society) کہہ کر پکارتا ہے اور یہی اس کی اس کتاب کا نام ہے جس سے یہ اقتباس دیا گیا ہے۔ قرآن کریم اس معاشرہ کی خصوصیات کو بڑی شرح و بسط سے بیان کرتا ہے۔ لیکن وہ اس کے ماحصل، منتہیٰ و مقصود کو، دو لفظوں میں سمیٹ دیتا ہے جب کہتا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ہم نے انسان کو واجب التکریم پیدا کیا ہے اور اس کی اس تکریم کا تحفظ معاشرہ کا منتہائے مقصود ہے۔ اقبال کے الفاظ میں :-

برتر از گردوں مقامِ آدم است　　اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

یہ ہے اس باب میں حرفِ آخر اور قولِ فیصل جس معاشرہ یا نظام میں فرد کے شرف اور احترام پر ذرا سی بھی زد پڑتی ہو، وہ انتہائی مردود و ملعون ہے، اور مقصدِ تخلیقِ کائنات کے حصول کی راہ میں روڑے اٹکانے کا موجب۔

ہزار گونہ فراغ و ہزار گونہ فروغ
یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود

خدا، اس کے ملائکہ اور عالمگیر انسانیت کی لعنت ہے اُس نظام، اُس مملکت، اُس معاشرہ پر جس میں فرد اپنی انفرادیت سے محروم، اور آدم شرفِ آدمیت سے مرحوم ہو جاتے ہے۔ اور ہر شخص سہمے سہمے زندگی بسر کرے۔ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ۔ (۳/۸۶)

—— (۰۰۰) ——

باسمہٖ تعالیٰ

طلوعِ اسلام کنونشن (اکتوبر ۱۹۷۴ء)

میں پیش کردہ خطاب

مرزائیت کے نقشِ قدم پر ــــــ لیکن

اس سے کہیں زیادہ خطرناک!

محمد اسلام

(نمائندہ بزم طلوعِ اسلام۔ کراچی)

مرزائیت کے نقشِ قدم پر —— لیکن

اس سے کہیں زیادہ خطرناک!

عزیزانِ گرامی قدر

جذباتی قوم بڑی سطح بین واقع ہوتی ہے اسی لئے بہت جلد دھوکا کھا جاتی ہے۔ ہمارے ہاں اس کی تازہ ترین مثال تحریک مرزائیت ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان میں آریوں، عیسائیوں اور مسلمانوں میں مناظروں کا بہت زور تھا۔ مرزا غلام احمد ایک مناظر کی حیثیت سے قوم کے سامنے آئے اور بہت مقبول ہو گئے۔ انہی موضوعات پر انہوں نے اپنی کتاب "براہینِ احمدیہ" شائع کی۔ جسے مسلمانوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگوں نے بھی اس کی تعریف کی۔ یہ سب کچھ ان کی جذبات پرستی اور سطح بینی کا نتیجہ تھا۔ حالانکہ اس میں مرزا صاحب نے بڑی سادگی و پرکاری سے ایسے جراثیم رکھ دیئے تھے جو آگے چل کر ان کے دعووں کی بنیاد بن سکتے تھے۔ چنانچہ مرزا صاحب نے خود لکھا ہے کہ جب عام مسلمان ہی نہیں بلکہ علماء حضرات تک ان کے "پیچ" میں پھنس گئے تو ان کے لئے ان کے دعووں کی تردید مشکل ہو گئی۔ قوم کی اس سطح بینی اور زود اعتقادی کا نتیجہ تھا کہ یہ قریب نوّے سال تک اس کشمکش میں گرفتار رہی جس سے خدا خدا کر کے اب جان چھوٹی ہے۔

اس تحریک سے تو اس کی جان چھوٹ گئی ہے۔ لیکن اس دوران میں یہ ایک اور تحریک کے دامِ ہمرنگِ زمین میں گرفتار ہو چکی اور ہوتی جا رہی ہے جو اپنے نتائج اور عواقب کے اعتبار سے تحریکِ مرزائیت سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ لیکن قوم اسے بالعموم اسی طرح احیاءِ اسلام کی داعی اور اقامتِ دین کی علمبردار سمجھ رہی ہے جس طرح اس نے ۱۸۸۰ء میں "براہینِ احمدیہ" کے مصنف کو اسلام کا خادم سمجھا تھا۔ اور یہ بھی عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ جس طرح "احمدیوں" کو خارج از اسلام قرار دینے کے سب سے پہلے عدالتی فیصلہ کی بنیاد مفکرِ قرآن پرویز صاحب کا ایک مقالہ تھا۔ اس جدید تحریک میں مضمر خطرات کو بھی سب سے پہلے انہی کی نگاہِ بصیرت نے پہچانا اور اس کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز ۱۹۴۱ء میں انہی کی طرف سے اٹھی۔ جب کسی کو ان خطرات کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تحریک ہے "جماعتِ اسلامی" کی جس کی بنیاد سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے ۱۹۴۱ء میں رکھی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ اس نام پر بہت سے کان کھڑے ہوں گے اور بہت سے ذہن اسے یہ کہہ کر جھٹک دیں گے کہ یہ محض تعصب ہے جو طلوعِ اسلام کو اس جماعت کے خلاف شروع سے چلا آ رہا ہے۔ مجھے ان احباب کی خدمت میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ نہ طلوعِ اسلام

کو اور نہ ہی مجھے اس جماعت یا اس کے بانی کے خلاف کوئی چڑ ہے یا تعصب، نفرت ہے یا رقابت۔ ہم عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے جو ہمیں ان سے رقیبانہ چشمک ہو۔ نہ ہی ہمیں کوئی مذہبی فرقہ پیدا کرنا ہے جو ان سے عداوت یا نفرت ہو۔ ہم نے ان کے لٹریچر کا اس طرح غائر نگاہ سے مطالعہ کیا ہے جس طرح تحریک مرزائیت کے لٹریچر کا۔ جس کے بعد ہم دیانتدارانہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ تحریک اُس تحریک سے بھی زیادہ خطرناک ہے جس سے قوم نے نوّے سال کی کشمکش کے بعد پیچھا چھڑایا ہے۔ اس بنا پر ہم یہ اپنا دینی فریضہ اور ملی تقاضا سمجھتے ہیں کہ قوم کے سامنے ان کی صحیح تصویر پیش کر دی جائے تاکہ یہ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے۔ ایسا کرنے میں میں اپنی طرف سے ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا۔ مودودی صاحب کی تحریروں کو مِن وعَن پیش کرتا چلا جاؤں گا۔ اور ساتھ کے ساتھ ان کے حوالے بھی دیتا جاؤں گا تاکہ جس کا جی چاہے انہیں چیک کر لے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری معروضات پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔

عام ریفارمر اور مامور من اللہ

مسلمانوں میں جب کوئی عام ریفارمر اٹھتا ہے تو وہ قوم سے کہتا ہے کہ ہم میں جس قدر خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اسلام سے دور ہٹ گئے ہیں۔ میں نے ان خرابیوں کے اسباب و علل پر غور کیا ہے تو ان کی اصلاح کی کچھ تجاویز میرے ذہن میں آئی ہیں۔ اگر آپ بھی ان سے متفق ہوں تو آیئے ہم سب مل کر ان کی اصلاح کی کوشش کریں۔

اس کے برعکس ان میں جب کوئی "مامور من اللہ" بن کر اٹھتا ہے تو وہ قوم سے کہتا ہے کہ تم میں کوئی مسلمان نہیں رہا۔ میں حقیقی اسلام کی دعوت لے کر اٹھا ہوں۔ تم میں سے جو اسے قبول کرنے پر آمادہ ہو، اسے چاہیئے کہ اس کے مطابق از سر نو ایمان لا کر میری جماعت میں شامل ہو جائے۔ مرزا غلام احمد نے یہی کہہ کر اپنی دعوت کو پیش کیا اور بعینہٖ یہی آواز مودودی صاحب نے دی۔ مودودی صاحب حیدرآباد (دکن) میں ایک عام صحافی تھے۔ مالی حالت (مرزا صاحب) کی طرح بڑی سقیم ہو گئی تو انہوں نے پنجاب کا رُخ کیا۔ ان کے اس انتقالِ مکانی کی تفاصیل ان کے اس زمانے کے بعض دوستوں کی زبانی مجھے معلوم ہوئیں۔ لیکن چونکہ میں اپنے موضوع کو ان کی تحریروں تک محدود رکھنا چاہتا ہوں اس لئے میں ان کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ اہل پنجاب کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔ (اور اسے میں اپنے پنجابی دوستوں سے معذرت کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ اگرچہ مجھے اس معذرت کی ضرورت نہیں کہ کہنے والا خود ایک پنجابی ہے۔) ضرب کلیم میں "پنجابی مسلمان" کے عنوان سے ان کی ایک نظم ہے جس میں انہوں نے کہا ہے۔

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت — کر لے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا — ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے
یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

مودودی صاحب کا تعارف

اہل پنجاب کی نفسیات کا یہ تجزیہ اور مرزا صاحب کی تحریک کی تاریخ مودودی صاحب کے سامنے تھی۔ انہوں نے ان کا مطالعہ کرنے کے

بعد پنجاب کو اپنا مستقر قرار دینے کا فیصلہ کر لیا اور مستقبل کے لئے ایک اسکیم مرتب کر لی۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنا تعارف یہ کہہ کر کرایا۔

> اسلام کو جس صورت میں، میں نے اپنے گرد وپیش کی مسلم سوسائٹی میں پایا میرے لئے اس میں کوئی کشش نہ تھی۔ تنقید وتحقیق کی صلاحیت پیدا ہونے کے بعد پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہی تھا کہ اس بے روح مذہبیت کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکا جو مجھے میراث میں ملی تھی .... پس درحقیقت میں ایک نو مسلم ہوں، خوب جانچ اور پرکھ کر اس مسلک پر ایمان لایا ہوں جس کے متعلق میرے دل ودماغ نے گواہی دی ہے کہ انسان کے لئے فلاح وصلاح کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے۔ میں صرف غیر مسلموں ہی کو نہیں، خود مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اس دعوت سے میرا مقصد اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کو باقی رکھنا اور بڑھانا نہیں ہے جو خود ہی اسلام کی راہ سے بہت دور ہٹ گئی ہے۔
>
> (سیاسی کشمکش حصہ سوم شائع کردہ مکتبہ جماعت اسلامی
>
> دارالاسلام پٹھان کوٹ صفحہ ۱۸-۱۷)

اس دعوت میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ان کے پیش نظر "اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کو باقی رکھنا اور بڑھانا نہیں" بلکہ ایک نئی مسلم سوسائٹی کی تخلیق ہے۔ چنانچہ اس بنا پر انہوں نے مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک پیدائشی یا نسلی مسلمان جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے چلے آرہے تھے اور دوسرے وہ جو ان کے ہاتھ پر ایمان لا کر مسلمان ہونے والے تھے یا ہوں گے۔ جہاں تک پیدائشی یا نسلی مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کے سلسلہ میں انہوں نے بہ تکرار واصرار اور بہ صراحت ووضاحت لکھا کہ نہ وہ مسلمان ہیں نہ انہیں مسلمان کہلانے کا حق حاصل ہے۔ انہیں چاہیئے کہ اپنا نام کچھ اور رکھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں تحریک پاکستان پھیل رہی تھی۔ اس تحریک یا مطالبہ پاکستان کی بنیاد اس اصول پر رکھی گئی تھی کہ مسلمان اشتراک ایمان کی بنا پر غیر مسلموں سے الگ اور منفرد قوم ہیں۔ اس لئے انکی جداگانہ مملکت ہونی چاہیئے جس میں یہ اسلامی نہج کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ مودودی صاحب اس تحریک کی سخت مخالفت کرتے تھے۔ آپ کا کہنا یہ تھا کہ جنہیں تم مسلمان کہتے ہو وہ مسلمان ہی نہیں اس لئے یہ مطالبہ ہی بے بنیاد ہے۔ ان کا ارشاد تھا۔

مسلمان اور مودودی صاحب

> ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں حقیقی معنوں میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا اسلامی اصول ہی پر ہوگا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ یہ انبوہ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ اس کے (۹۹۹) فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق وباطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ہی ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا رہا ہے اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر قبول کیا ہے نہ باطل کو

باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۱ھ)

ان کا ارشاد تھا کہ یہ مسلمانوں کا معاشرہ نہیں۔ "یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل کوّے، گدھ، تیتر، بٹیر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے"۔

(ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ)

وہ کہتے تھے۔

ایک حقیقی مسلمان کی حیثیت سے جب میں دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہارِ مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ترکی پر ترک، ایران پر ایرانی اور افغانستان پر افغان حکمران ہیں . . .
مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں اُن کی اپنی حکومت قائم ہو جائے۔

(ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ)

مودودی صاحب نے کہا ہے کہ انہیں اس سے کچھ مسرت نہیں کہ ترکی پر ترک یا ایران پر ایرانی حکمران ہیں۔ بعینہٖ یہی مسلک مرزائیوں کا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب پہلی جنگِ عظیم میں ترکوں کو شکست ہوئی ہے جس سے مسلمانوں کے گھروں میں صفِ ماتم بچھ گئی تھی تو مرزائیوں نے قادیان میں جشنِ مسرت منایا اور چراغاں کیا تھا۔ مودودی صاحب نے یہاں تک کہہ دیا کہ

جو لوگ اپنے خیالات، اپنے اخلاق، اپنی معاشرت، اپنی معیشت، اپنی تعلیم، غرض اپنی کسی چیز میں بھی مسلمان نہیں ہیں اور مسلمان رہنا نہیں چاہتے، ان کے برائے نام مسلمان رہنے سے اسلام کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں۔ بلکہ سراسر نقصان ہے . . . . لہٰذا اگر کروڑوں کی مردم شماری میں سے ان سب منافقین اور غلام فطرت لوگوں کے نام کٹ جائیں . . . . تو یہ اسلام کے حق میں ایسا ہی ہوگا جیسے کسی مریض کے جسم سے پیپ اور کچ لہو نکل جاتا ہے۔ (تنقیحات۔ صـ ۱۸۲)

مرزا صاحب نے بھی موجودہ مسلمانوں کو نا مسلم قرار دے کر کہا تھا کہ انہیں مسلمان کہلانے کا کوئی حق نہیں۔ مسلمان صرف وہ ہیں جو میرا اتباع کریں۔ باقیوں کو اپنا نام کچھ اور رکھ لینا چاہیئے۔ بعینہٖ یہی مطالبہ مودودی صاحب کا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو مسلمان کہہ کر پکارنے والوں سے علی الاعلان کہا کہ

آپ اپنی قوم کا نام جو چاہیں تجویز فرمائیں۔ اسلام کا نام استعمال کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے

(ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ)

دوسری جگہ ارشاد ہوا کہ جو لوگ (یعنی قائدِ اعظمؒ اور ان کے ساتھی) پاکستان کا مقدمہ لڑ رہے ہیں انہیں اسلام اور اسلامی امت کے نام سے یہ مقدمہ پیش کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ایسا مقدمہ لے کر اٹھنے والوں کو اپنی قومیت کا کوئی دوسرا نام تجویز کرنا چاہیئے۔

(ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۴۰ء۔ جنوری ۱۹۴۱ء صـ ۲۷)

مسلمانوں کو اس طرح غیر مسلم قرار دے کر۔ اور انہیں یہ کہہ کر کہ تمہیں اسلامی امت کہلانے کا کوئی حق نہیں، تمہیں

جماعتِ اسلامی

اپنی قومیت کا کوئی دوسرا نام تجویز کرنا چاہیئے، مودودی صاحب نے اپنی جماعت کی تشکیل کی جس کا نام "جماعتِ اسلامی" رکھا بعینہٖ جس طرح مرزا صاحب نے مسلمانوں کو غیر مسلم قرار دے کر اپنے متبعین کو مسلمان کہہ کر پکارا تھا۔ اس جماعت میں داخلہ کے متعلق مودودی صاحب نے کہا کہ

> صرف وہی شخص جماعتِ اسلامی میں داخل ہوسکتا ہے خواہ وہ پیدائشی غیر مسلم ہو اور ابتداءً یہ شہادت ادا کرے، یا پیدائشی مسلمان ہو اور از سرِ نو ایمان لائے۔
>
> (ترجمان القرآن محرم ۱۳۶۱ھ ص ۸۴)

آپ نے غور فرمایا کہ جماعتِ اسلامی میں داخلہ کے لئے مسلمانوں کو بھی اسی طرح از سرِ نو ایمان لانا پڑتا تھا جیسے غیر مسلموں کو۔ یعنی جو لوگ اس جماعت میں داخل نہیں ہوتے تھے، انہیں مودودی صاحب 'صاحبِ ایمان' (مسلمان) تسلیم نہیں کرتے تھے، اس لئے انہیں بھی جماعت میں داخلہ کے لئے از سرِ نو ایمان لانا پڑتا تھا۔ اس جماعت کی تشکیل کے پہلے دن کی روئداد میں کہا گیا ہے کہ مودودی صاحب نے پہلے ایک تفصیلی تقریر کی اور اس کے بعد'

> وہ اٹھے اور کلمہ شہادت اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ واشھد ان محمد رسول اللّٰہ کا اعادہ کیا اور کہا کہ لوگو! گواہ رہو کہ میں آج از سرِ نو ایمان لاتا ہوں اور جماعتِ اسلامی میں شریک ہوتا ہوں۔ اس کے بعد محمد منظور نعمانی صاحب کھڑے ہوئے اور آپ نے بھی مودودی صاحب کی طرح تجدیدِ ایمان کا اعلان کیا۔ بعض ازاں حاضرین میں سے باری باری کر کے ہر شخص اٹھا۔ کلمۂ شہادت ادا کیا اور جماعت میں شریک ہوا۔
>
> (ترجمان القرآن، ماہ جون جولائی اگست ۱۹۴۱ء)

آپ غور فرمایئے عزیزانِ من! کہ اس میں اور مرزا صاحب کے مسلک میں کچھ بھی فرق ہے؟ وہ بھی موجودہ مسلمانوں سے از سرِ نو ایمان لانے کا مطالبہ کرتے تھے اور جو شخص تجدیدِ ایمان کر لیتا تھا اُسے اپنی جماعت میں داخل کر لیتے تھے۔ (ضمناً مولانا محمد منظور نعمانی صاحب جو اس "تجدیدِ ایمان" کے بعد جماعتِ اسلامی میں داخل ہوئے تھے، تھوڑے ہی دنوں بعد اپنے اس ایمان سے منحرف ہو کر "پیدائشی مسلمانوں" کے گروہ میں واپس چلے گئے۔ معلوم نہیں مودودی صاحب نے ان کے خلاف مرتد ہو جانے کا فتویٰ صادر کیا تھا یا نہیں)

بہرحال اس طرح نئے سرے سے اسلام لانے والوں کی اس جماعت کی تشکیل ہوئی۔ جو مسلمان اس میں داخل نہ ہوئے وہ مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق غیر مسلم کے غیر مسلم رہے۔ نہ صرف غیر مسلم بلکہ سیرت و کردار سے بھی عاری۔ کیونکہ مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ

> پہلا کام اس جماعت نے یہ کیا ہے کہ اس نے اس ملک میں قابلِ اعتماد کیریکٹر رکھنے والے لوگوں کو منظم کیا ہے۔
>
> (اعتصام۔ ۱۵ جولائی ۱۹۵۵ء)

گویا جماعتِ اسلامی وہ جماعت ہے جو "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کہہ کر پکارے جانے کی مستحق ہے۔ باقی مسلمان نہ صاحبِ ایمان ہیں نہ صاحبِ کردار۔ انہیں مسلمان کہلانے کا حق ہی حاصل نہیں۔ انہیں اپنا کوئی الگ نام رکھنا چاہیئے۔ اور یہ ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہے کہ یہ حضرات اُن مسلمانوں کے خلاف جو اس جماعت میں داخل نہیں، اسی طرح جذباتِ نفرت اپنے دلوں میں رکھتے ہیں جس طرح مرزائی حضرات غیر مرزائیوں کے

خلاف۔ خود مودودی صاحب کے دل میں "غیر صالحین" مسلمانوں کے خلاف کس قدر جذبات نفرت و عداوت موجزن رہتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے لگتا ہے کہ وہ بات بات پر ان مسلمانوں کے دائرۂ اسلام سے اخراج کا فتویٰ صادر فرما دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک تازہ ترین مثال ملاحظہ فرمائیے۔ ہفتہ وار ایشیا کی ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں مودودی صاحب کے خطبۂ عید کا ایک اقتباس شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ رمضان المبارک کے بابرکت ماحول کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

> اس ماحول میں بھی اگر کوئی شخص غیر متاثر رہتا ہے۔ خدا کی طرف سے کوئی رجوع اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتا۔ نماز، روزے اور تلاوتِ قرآن کے لئے کوئی رغبت اس دل میں نہیں ابھرتی، تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کا دل جذبۂ ایمان سے خالی ہے۔ اسلام سے اس کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ خدا اور اس کے دین کے ساتھ اور مسلمانوں کی ملت کے ساتھ جتنے روابط ہو سکتے ہیں ان سب کو اس نے کاٹ پھینکا ہے۔

نماز روزے کی پابندی نہ کرنا معصیت خداوندی ہے (جسے عرفِ عام میں گناہ کہا جاتا ہے) اور خدا کے ہاں بیشک اس کا مواخذہ ہوگا، لیکن ایسا کرنے والوں کے متعلق یہ کہنا کہ

(۱) ان کا دل جذبۂ ایمان سے قطعاً خالی ہے۔

(۲) اسلام سے ان کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ اور

(۳) خدا، اور اس کے دین اور مسلمانوں کی ملت کے ساتھ جتنے روابط ہو سکتے ہیں، انہوں نے ان سب کو کاٹ پھینکا ہے۔

انتہائی زیادتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ (مودودی صاحب کے نزدیک) ایسے لوگ (جن کی تعداد، خود مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق، بڑی کثیر ہے) دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتے ہیں، اور امتِ محمدیہ کے فرد نہیں رہتے۔ گنہگار اور کافر میں جو فرق ہے وہ ایسا نمایاں ہے کہ اسے غالب جیسا شاعر بھی جانتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ

صد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

لیکن مودودی صاحب کے دل میں امتِ محمدیہ کے افراد کے خلاف بغض و عداوت کے جذبات اس قدر شدید ہیں، کہ وہ ہر گنہگار کو کافر قرار دیتے ہیں[1]۔ یہی وہ چھائی ہے جس کے نتیجہ کے طور پر اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا کہ۔

سب ہو چلے ہیں اس بت کافر ادا کے ساتھ ... رہ جائیں گے رسول ہی بس اب خدا کے ساتھ

(-)

[1] مودودی صاحب کا "رندہ" اور مرزائیوں کا "تیشہ" کس طرح ایک تھیلے کے اوزار ہیں، اس کا اندازہ اس سے بھی لگتا ہے کہ مودودی صاحب کے مندرجہ بالا اقتباس کو مرزائیوں کے اخبار الفضل (ربوہ) نے اپنی اشاعت بابت ۲۸ نومبر ۱۹۷۶ء ... میں نقل کیا ہے۔ (غالباً) یہ بتلانے کے لئے کہ خارج از اسلام ہم (مرزائی) ہی قرار نہیں پاتے ... (...) کثیر تعداد بھی اسی زمرہ میں شمار ہوتی ہے۔ (طلوع اسلام)

مودودی صاحب نے کہا تھا کہ میں غیر مسلموں ہی کو نہیں بلکہ خود مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں آیئے ہم ایک نظر دیکھیں کہ وہ کس قسم کا اسلام ہے جس کی طرف یہ مسلم و غیر مسلم کو دعوت دیتے ہیں۔

حضور رسالتمآبؐ اور مودودی صاحب

قلبِ مومن میں حضور رسالتمآبؐ کا جو مقام ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ حضورؐ کے متعلق مودودی صاحب ایک طرف یہ لکھتے ہیں کہ

> جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصبِ رسالت سے سرفراز کیا اس وقت سے لے کر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا...... حتیٰ کہ آپ کی نجی اور خاندانی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اس حیثیت کے تحت آ گئے تھے۔
>
> (تفہیمات حصہ اول صـ۲۲۴)

اب دوسری طرف دیکھئے۔ دجّال کے متعلق احادیث کا ذکر کرنے کے بعد مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

> اِن امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں۔ وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں جن کے متعلق آپ خود شک میں تھے کبھی آپ نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ دجّال خراسان سے اٹھے گا کبھی یہ کہ اصفہان سے اور کبھی یہ کہ شام و عراق کے درمیانی علاقہ سے پھر کبھی آپ نے ابن صیاد نامی اس یہودی بچے پر جو مدینہ میں غالباً ۲ھ یا ۳ھ میں پیدا ہوا تھا، یہ شبہ ظاہر کیا کہ شاید یہی دجّال ہو...... یہ تردّد اول تو خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ باتیں آپ نے علمِ وحی کی بنا پر نہیں فرمائی تھیں بلکہ اپنے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں اور آپ کا گمان وہ چیز نہیں جس کے صحیح ثابت نہ ہونے سے آپ کی نبوت پر کوئی حرف آتا ہو یا جس پر ایمان لانے کے لئے ہم مکلف کئے گئے ہیں۔ (رسائل و مسائل حصہ اول صـ۵۵-۵۶)

یعنی ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ حضورؐ زندگی کے ہر سانس میں خدا کے رسول تھے اور آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا اور دوسری طرف ان امور کو آپؐ کے ذاتی خیالات قرار دیا جاتا ہے جن کے متعلق آپ کو خود بھی شک اور تردد تھا سوچیے کہ اس سے آپ کے (یا کم از کم مخالفینِ اسلام کے دل میں حضورؐ کا کس قسم کا تصور قائم ہوتا ہے۔

یہ تو تھا آپؐ کے اقوال کے متعلق۔ اب حضورؐ کے افعال کی طرف آیئے۔ رسول کی صداقت اور عظمت کا ایک بنیادی ثبوت یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ جو اصول دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے، ان پر عمل کر کے دکھاتا ہے اور کسی حالت میں ان سے انحراف نہیں برتتا۔ لیکن مودودی صاحب کا اس باب میں کیا عقیدہ ہے وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ ۱۹۵۶ء میں جماعتِ اسلامی کے بہت سے سرکردہ حضرات نے مودودی صاحب کے خلاف یہ الزام عائد کیا کہ انہوں نے جماعت کی تشکیل کے وقت جو اصول پیش کئے تھے عملی سیاست کے میدان میں پہنچ کر ان سے انحراف برتنے لگ گئے ہیں۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے کہا کہ اگر میں نے ایسا کیا ہے تو کون سا جرم کیا ہے۔ (معاذ اللہ) خود رسول اللہؐ نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ مثلاً:-

اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرق مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرماں روائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت کی کہ، امام قریش میں سے ہوں۔" ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص معاملہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیئے کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

(رسائل و مسائل حصہ چہارم صفحہ ۲۳)

اس پر جب مودودی صاحب پر خود اپنے رفقاء کی طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہوئی تو انہوں نے انہیں ڈانٹ کر کہا کہ تم اصول شکنی کرتے ہو،

عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتوےٰ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء)

اور اس کے بعد انہوں نے یہ کہنے کی بھی جرأت کر لی کہ

اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلم کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں؟ حضورؐ نے بالفاظِ صریح انہیں اس کی اجازت دے دی۔ (ترجمان القرآن۔ مئی ۵۸ء)

یہ ہے حضور رسالتمآبؐ کی سیرت کا وہ نمونہ جسے یہ صاحب دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ (استغفر اللہ!)

صحابہؓ اور مودودی صاحب

رسول اللہ کے بعد صحابہؓ کا مقام ہے جنہیں قرآن کریم نے بلا استثناء مومن حقا کہہ کر پکارا ہے۔ صحابیؓ اس مسلمان کو کہتے ہیں جو رسول اللہ کی زندگی میں ایمان لایا ہو۔ لیکن مودودی صاحب ان میں عام اور خاص کا امتیاز قائم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

حقیقت یہ ہے کہ عامی لوگ نہ کبھی عہد نبویؐ میں معیاری مسلمان تھے اور نہ اس کے بعد کبھی ان کو معیاری مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ (تفہیمات۔ حصہ اول۔ ص ۳۳۳)

اسکے بعد مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ صحابہؓ میں ایسے بھی تھے جو رسول اللہ کی وفات کے بعد (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے۔ یعنی جس کفر کی طرف سے آئے تھے اسی کی طرف واپس چلے گئے تھے۔ (رسائل و مسائل حصہ سوم۔ ص ۲۱۴)

تشکیلِ پاکستان کے بعد جماعت اسلامی کو ابھی اتنی مقبولیت حاصل نہیں تھی کہ اسے انتخابات میں کامیابی کی امید ہو سکتی۔ اس بنا پر مودودی صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے اور ساتھ ہی یہ فتوےٰ صادر فرما دیا کہ اسلام میں یہ جائز ہی نہیں کہ کوئی شخص کسی منصب کے لئے خود بطور امیدوار کھڑا ہو۔ اس پر کسی نے ان سے کہا کہ حضرت علیؓ نے منصب خلافت کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا تھا ان کے متعلق آپ کیا کہیں گے، اس کے

حضرت علیؓ

جواب میں مودودی صاحب نے لمبی چوڑی بحث کے بعد فرمایا کہ

"آخری فیصلہ کن بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر صحابہ کرامؓ یا بزرگانِ سلف

میں سے کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اس کے رسول کے صاف صاف ارشادات دوسری طرف، تو ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ خدا اور اس کے رسول کے فرمان کو چھوڑ کر کسی بزرگ کے عمل کو اپنے لئے قانونِ زندگی قرار دیں۔ جس کا جو عمل بھی فرمانِ خدا اور رسول سے مختلف ہو وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حجت۔ ان بزرگوں کی خوبیاں اور خدمات تو اتنی تھیں کہ ان کی لغزشیں معاف ہو جائیں گی۔ مگر ہم سے زیادہ بدقسمت کون ہوگا کہ ہم اپنے گناہوں کے ساتھ اگلے پچھلے بزرگوں کی لغزشیں بھی چن چن کر اپنی زندگی میں جمع کر دیں۔

(ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء)

یعنی مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ حضرت علیؓ جیسے صحابی علی الرغم خدا اور رسول کے احکام کے خلاف عمل کرتے تھے اور یہ ان کی لغزش تھی۔ (معاذ اللہ)۔ اور آپ کو شاید یاد ہوگا کہ اس کے بعد جب مودودی صاحب کو کچھ اندازہ ہوا کہ ان کی جماعت انتخابات میں کامیاب ہو جائے گی تو انہوں نے فتوے صادر فرما دیا کہ انتخابات میں حصہ لینا اور اپنے آپ کو بحیثیت امیدوار پیش کرنا عین مطابقِ اسلام ہے۔

مودودی صاحب کا ایک وقت میں فتویٰ یہ تھا کہ اسلام میں عورتوں کے لئے سیاست میں حصہ لینا جائز نہیں۔

حضرت عائشہ

اس پر کسی صاحب نے اعتراض کیا کہ اگر ایسا ہی ہے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے شہادتِ حضرت عثمانؓ کے سلسلہ میں عملی سیاست میں حصہ کیوں لیا تھا۔ اسکے جواب میں انہوں نے کہا کہ یہ حضرت عائشہؓ کی لغزش تھی۔

صحابہؓ کی پاکیزہ زندگیاں بلاشبہ ہمارے لئے مشعلِ ہدایت ہیں، مگر اس غرض کے لئے کہ ہم انکی روشنی میں اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں۔ نہ اس غرض کے لئے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت کو چھوڑ کر ان میں سے کسی کی انفرادی لغزش کا اتباع کریں۔

(ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۵۲ء)

اور شاید آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ اس کے بعد جب مس فاطمہ جناح (مرحومہ) منصب صدارت کے لئے بطور امیدوار کھڑی ہوئی ہیں تو مودودی صاحب اور ان کی جماعت نے ان کی تائید میں بھرپور حصہ لیا تھا اس وقت عورت کا سیاست میں حصہ لینا عین مطابق اسلام قرار پایا تھا۔

اسلام کی ہیئتِ اجتماعیہ کے سلسلہ میں "خلافتِ راشدہ" مسلمانوں کے نزدیک نمونہ ہے۔ لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے بعد

حضرت عثمانؓ

زمامِ اقتدار حضرت عثمانؓ کی طرف منتقل ہوئی اور ابتدائً چند سال تک وہ نقشہ بدستور رہا جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا۔ مگر ایک طرف حکومت اسلامی کی تیز رفتار وسعت کی وجہ سے کام روز بروز زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا۔۔۔ دوسری طرف حضرت عثمانؓ جن پر اس کارِ عظیم کا بار رکھا گیا تھا ان تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے جلیل القدر پیشرو کو عطا ہوئی تھیں۔ اس لئے جاہلیت کو اسلامی نظامِ اجتماعی کے اندر

> گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنا سر دے کر اس خطرے کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رکا۔ اُن کے بعد حضرت علیؓ آگے بڑھے اور انہوں نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو جاہلیت کے تسلط سے بچانے کی انتہائی کوشش کی مگر ان کی جان کی قربانی بھی اس انقلاب معکوس کو نہ روک سکی۔ آخر خلافت علیٰ منہاج نبوت کا دور ختم ہو گیا اور ملوکیت نے اس کی جگہ لے لی اور اس طرح حکومت کی اساس اسلام کی بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہو گئی۔
>
> (تجدید و احیائے دین صفحہ ۳۵)

تابعین

یہاں تک آپ نے دیکھ لیا کہ مودودی صاحب حضور رسالتمآبؐ، امہات المومنینؓ، صحابہ کبارؓ، خلفائے راشدینؓ کی سیرت و کردار کا کیا تصور پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ اب آگے بڑھیئے۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے اتنا سمجھ لیجئے کہ جو شخص اپنے لئے کوئی خاص مقام پیدا کرنا چاہتا ہے، اس کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے پیش روؤں میں سے ایک ایک کو (CONDEMN) کرتا چلا جاتا ہے۔ اور آخر الامر یہ دعویٰ کر دیتا ہے کہ جس مشن کو کامیاب بنانے میں یہ حضرات ناکام رہ گئے تھے اسے کامیاب کرنے کے لئے میں پیدا ہوا ہوں۔ یہی انداز مرزا صاحب نے اختیار کیا تھا۔ انہوں نے انبیاء، اولیاء، صحابہ، خلفاء، اہل بیت، محدثین، مفسرین، ائمہ، علماء وغیرہ میں سے کسی کو بھی نہیں بخشا تھا۔ ان سب کو اپنے سے پیچھے چھوڑتے چلے آتے تھے۔ یہی ٹیکنیک مودودی صاحب اختیار فرما رہے ہیں۔ صدر اول تک ان کی تنقید کو ہم دیکھ چکے ہیں۔ اس کے بعد حضرت معاویہؓ اور ان سے متصل زمانہ کی تاریخ کے سلسلہ میں انہوں نے اپنی رسوائے عالم کتاب "خلافت و ملوکیت" میں صحابہؓ اور تابعینؒ کی سیرت و کردار کا جو نقشہ پیش کیا ہے اسے کوئی مسلمان دل پر ہزار ضبط کئے بغیر دیکھ نہیں سکتا۔ میں بھی دل پر پتھر رکھ کر اس سے صرف ایک اقتباس پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ یزید کے زمانہ میں مدینہ پر جو حملہ ہوا اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

> وحشی فوجیوں نے گھروں میں گھس گھس کر بے دریغ عورتوں کی عصمت دری کی (حافظ ابن کثیر کے قول کے مطابق) اُن دنوں میں ایک ہزار عورتیں زنا سے حاملہ ہوئیں۔
>
> (خلافت و ملوکیت۔ صفحہ ۱۸۲)

یہ ۶۳ھ کا واقعہ بتایا جاتا ہے۔ اُس زمانے میں مدینہ کی آبادی مشتمل تھی صحابہؓ اور تابعین پر۔ ان میں مرد بھی شامل تھے اور عورتیں بھی۔ آپ سوچئے کہ (مودودی صاحب کے بیان کے مطابق) ان مردوں کی موجودگی میں ان کی بیویوں، بہو بیٹیوں کے ساتھ یہ کچھ ہوا اور نہ انہوں نے اس میں کوئی مزاحمت کی اور نہ ہی ان مردوں کی غیرت و حمیت جوش میں آئی اور پھر زنا کے اس ایک ہزار حمل سے جو نسل آگے بڑھی اس کے متعلق کیا کہا جائے گا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ سلفِ امت کے خلاف مودودی صاحب کے سینے میں کس قدر نفرت اور عداوت کی آگ بھڑک رہی ہے!

اسلاف

ان کے بعد امت کے اسلاف کا زمانہ آتا ہے۔ ان کے متعلق مودودی صاحب کہتے ہیں کہ:۔

میں ان میں سے کسی کی تحقیق کو حرف آخر نہیں سمجھتا۔ اور جب میں ان کے بیانات

سے اطمینان نہیں ہوتا تو خود غور و فکر کر کے رائے قائم کرتا ہوں۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۱۶۰)

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ۔

یہ سلف کون سے انبیاء تھے جن پر ایمان لانے کو مسلمانوں کو تکلیف دی گئی ہے۔

(تفہیمات دوم صفحہ ۱۳۷)

بلکہ یہاں تک بھی کہ:۔

جو لوگ تفسیر کی کتابوں میں کوئی حدیث یا اثر دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ آیت کا مفہوم صرف اس قدر ہے اور اس سے زاید یا اس سے مختلف مفہوم بیان کرنے والے کو حدیث یا اثر کا منکر قرار دیتے ہیں وہ دراصل سلف کے طریقے سے ناواقف ہیں اور اپنے جہل کی کند چھری سے بندگانِ خدا کے ایمان کو ذبح کرتے ہیں۔ (تفہیمات دوم صفحہ ۱۳۸)

امام ابن تیمیہؒ کے متعلق لکھتے ہیں کہ

وہ بھی کوئی ایسی تحریک نہ اٹھا سکے جس سے نظامِ حکومت میں انقلاب برپا ہوتا اور اقتدار کی کنجیاں جاہلیت سے نکل کر اسلام کے ہاتھ میں آتیں۔

(تجدید و احیائے دین صفحہ ۳۱)

حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے متعلق لکھتے ہیں۔

پہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وقت سے شاہ صاحب اور ان کے خلفاء تک کے تجدیدی کام میں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا پورا اندازہ نہیں لگایا اور ان کو پھر وہی غذا دے دی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی۔ (تجدید و احیائے دین صفحہ ۳۳۹)

واضح رہے کہ مودودی صاحب تصوف کے منکر نہیں۔ انہیں اس کا بھی اعتراف ہے کہ۔

جو تصوف ان حضرات نے پیش کیا تھا وہ بجائے خود اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کا اصلی تصوف ہے۔ (ایضاً)

وہ کہتے ہیں۔

ان دونوں بزرگوں کے تجدیدی اور اصلاحی کارناموں کے اعتراف کے باوجود یہ کہے بغیر چارہ نہیں ہے کہ ان کے اپنے مجدد ہونے کی خود تصریح کرنا اور بار بار کشف و الہام کے حوالے سے اپنی باتوں کو پیش کرنا ان کے شایانِ شان نہ تھا۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ سوم۔ صفحہ ۳۵۷)

ہم عصر علماء

یہ تو رہا اسلاف کے متعلق۔ اپنے ہمعصر علماء اور مشائخ کے خلاف جو کچھ مودودی صاحب نے کہا ہے۔ اسے تفصیل سے بیان کرنے کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ اس وقت میں

صرف ان کے ان الفاظ کو پیش کرنے پر اکتفا کروں گا جن میں انہوں نے کہا ہے کہ یہ علماء ہیں،

> جبّوں اور عماموں میں لپٹے ہوئے سیاہ دل اور گندے اخلاق ہیں۔ زبان سے وعظ اور عمل میں بدکاریاں۔ ظاہر میں خدمتِ دین اور باطن میں خیانتیں اور غداریاں اور نفسانی اغراض کی بندگیاں۔
>
> (تحریکِ آزادیٔ ہند صـ۱۰۳)

مرزا صاحب کے متعلق عام شکایت تھی کہ وہ اپنے مخالف علماء کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ اس باب میں جماعتِ اسلامی کی کیا روش رہی ہے اس کا اندازہ آپ ایک مثال سے لگا لیجئے۔ مولانا احمد علی (مرحوم) ایک بلند پایہ عالم اور مفسر تھے اور دوست دشمن ان کے اخلاص اور تقویٰ کے معترف تھے وہ مودودی صاحب کی مخالفت کرتے تھے۔ ان کے خلاف ان کی جماعت کی طرف سے کس قسم کے رکیک الفاظ استعمال ہوتے تھے اس کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے جو اس جماعت کے ترجمان ایشیا میں شائع ہوتے تھے۔

> جاہل، بہتان تراش، مفتری، اخلاقی تعلیمات سے بے بہرہ، تقوی، تقدس، للّٰہیت، اور تقربِ الٰہی کا ڈھونگ رچانے والے، فریبی، جھوٹے، مذبوحی حرکتیں کرنے والے، علم و اخلاق سے بے تعلق، فاسد ذہنیت کے مالک، پیشہ ور دیندار، عقل کے اندھے، غیر ذمہ دار خدا اور مخلوق کی شرم سے بے بہرہ، بے حیا، ... بیوقوف، گھناؤنے اور مکروہ اخلاق کے مالک دیوبند کی چراگاہ سے نکلے ہوئے، فریبی دجل و کذب کے مالک، کفن چور، افیونی شوریدہ سر وغیرہ۔
>
> (بحوالہ۔ الاعتصام۔ مورخہ ۱۸/۱۱/۵۵)

یہ تو رہا طبقہ علماء کے متعلق جہاں تک ملک کی مختلف جماعتوں کا تعلق ہے۔ مودودی صاحب کا ارشاد تھا۔

> اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام پر کام کر رہی ہیں اگر فی الواقع اسلام کے معیار پر ان کے نظریات اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنس کاسد نکلیں گی۔ خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علماء دین و مفتیان شرع متین۔ دونوں قسم کے راہ نما اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔
>
> (ترجمان القرآن۔ جلد ۱۷، صـ۵)

یعنی سب راہ نما یکساں راہ گم کردہ۔ صرف یہ حضرت خود (یعنی مودودی صاحب) حق کے راستے پر گامزن اور سب تحریکیں فاسد، صرف جماعت اسلامی (رخالص) کیا یہ وہی ادعا نہیں جو مرزا صاحب نے پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے۔

علمائے متقدمین اور متاخرین کے متعلق مودودی صاحب کی تنقیدیں سن لینے کے بعد اب دیکھئے کہ ان کے معتقدین انکے علم و فضل کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ ان کے ماہنامہ ترجمان القرآن کی نومبر ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں تحریر ہے۔

> مولانا مودودی صاحب کوئی اکیڈیمک قسم کے مصنف نہیں ہیں کہ انہوں نے مجرد علمی خدمت کے لئے زندگی سے غیر متعلق مسائل پر خامہ فرسائی کی ہو۔ وہ کوئی کاہل قسم کے آدمی بھی نہیں ہیں کہ ایک

خاص مسلک کی عربی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے اس کو اپنے لفظوں میں اردو میں منتقل کر دیتے ہوں وہ کوئی جامد اور مقلد قسم کے آدمی نہیں ہیں کہ ان کا سارا تصنیفی کارنامہ مکھی پر مکھی مار دینا ہو۔ وہ دین اور دنیا کی تفریق کے وہم میں بھی مبتلا نہیں ہیں کہ ان کا سارا زورِ قلم "غسل اور وضو" کے مسائل تک محدود ہو۔ وہ ایک داعی اور مصلح کی شان رکھتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں دعوت واصلاح کے مقصد کو سامنے رکھ کر لکھتے ہیں۔ اسی مقصد کی خاطر انہوں نے دین کی متعدد ایسی حقیقتوں کو برملا آشکارا کیا ہے جو اگرچہ دین کی نہایت ثابت و معروف حقیقتیں رہی ہیں۔ لیکن اس دورِ زوال میں ان کو ان کی وضاحت کے ساتھ کہنے کی ہمت لوگ کھو بیٹھے تھے۔ اسی اصلاح کے مقصد کی خاطر ان کو صرف مسلمانوں کے گمراہ فرقوں ہی پر نہیں بلکہ اُن فقہی گروہوں پر بھی تنقیدیں کرنی پڑی ہیں جو صحیح بنیاد پر ہونے کے باوجود بہت سی بے اعتدالیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انہیں ان لوگوں سے بھی لڑنا پڑا ہے جو بے جا تعصبات اور جامد بندشوں میں گرفتار ہیں انہیں دین کے صحیح تصور اور اس کے نظام کے احیاء کی خاطر ان لوگوں سے بھی نبرد آزمائی کرنی پڑی ہے جو موجودہ معاشرے کی قیادت کر رہے ہیں۔ الغرض انہوں نے جب سے قرطاس و قلم کا مشغلہ[1] اختیار کیا ہے ان کو اپنے گرد و پیش سے ایک چومکھیا لڑائی لڑنی پڑی حنفی اور اہلحدیث، بریلوی اور دیوبندی۔ صوفی و ملاّ۔ مقلد اور غیر مقلد۔ شیعہ اور قادیانی۔ منکرِ حدیث اور منکرِ شریعت۔ نیشنلسٹ اور کمیونسٹ۔ کانگریسی اور مسلم لیگی، غرض کوئی ایسا نہیں ہے جس پر ان کو تنقید نہ کرنی پڑی ہو اور وہ ان کے لٹریچر کے کسی نہ کسی حصہ سے بیزار نہ ہو۔

(۰)

اتباعِ حدیث

مرزا صاحب کے لٹریچر پر غور کیجئے وہ اتباعِ سنت اور اطاعتِ نبی اکرم پر اس شد و مد سے زور دیتے تھے کہ عام لوگوں کی نگاہوں میں وہ عاشقِ رسول نظر آتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ اتباعِ سنت اور اطاعتِ رسولؐ، احادیث کی رو ہی سے ممکن ہے اس لئے وہ اقرارِ حدیث کو ایمان کا درجہ دیتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، یہ بات نظر بظاہر بڑی خوش آیند دکھائی دیتی ہے لیکن درحقیقت یہی وہ دامِ ہمرنگِ زمین ہے جسے انہوں نے دوسروں کو اپنے مسلک میں پھنسانے کے لئے استعمال کیا تھا۔ انہوں نے پہلے کہا کہ احادیث کا اتباع مسلمان ہونے کے لئے ناگزیر ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے خلاف مسلمان کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ حدیثوں کے موجودہ مجموعوں میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور غلط بھی۔ اتباع صحیح حدیثوں کی کی جائے گی، غلط کی نہیں۔ مسلمان اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کر سکتے تھے۔ مسلمانوں کو یہاں تک ساتھ لے آنے کے بعد انہوں نے کہا کہ سوال یہ ہے کہ صحیح اور غلط حدیثوں کا معیار

---

[1] مشغلہ! بہت خوب۔ اگر "پیشہ" کہتے تو اس سے بھی زیادہ موزوں ہوتا۔

کیا ہے اور اس کے جواب میں کہا کہ جو حدیث میری وحی کے مطابق ہے وہ صحیح ہے جو اس کے خلاف ہے وہ غلط ہے۔ ان کے الفاظ ہیں۔

> جو شخص حکم ہو کر آیا ہے اس کو اختیار ہے کہ حدیثوں کے ذخیرہ میں سے جس انبار کو چاہے خدا سے علم پاکر قبول کرے اور جس ڈھیر کو چاہے خدا سے علم پاکر رد کر دے۔
>
> (تحفۂ گولڑویہ۔ صفحہ ۱۰)

اس طرح مرزا صاحب کے فیصلوں کی اطاعت، رسول اللہ کی اطاعت قرار پا گئی جس سے انکار کفر قرار دے دیا گیا۔ اس سے آپ نے یہ دیکھ لیا کہ مرزا صاحب احادیث کی اہمیت پر اس قدر زور کیوں دیتے تھے۔

بعینہٖ یہی مؤقف مودودی صاحب کا ہے۔ یہ بھی احادیث کی اہمیت پر بے حد زور دیتے ہیں اور حدیث کے انکار کو کفر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا مسلک بھی یہی ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں میں غلط احادیث بھی ہیں اور صحیح بھی۔ اطاعت صحیح احادیث کی جائے گی نہ کہ غلط کی۔ اس کے بعد یہ سوال سامنے لایا گیا کہ احادیث کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار کیا ہے۔ مرزا صاحب کی تحریک کا تجربہ مودودی صاحب کے سامنے تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ وہ خدا سے علم پاکر یا حکم ہو کر احادیث کا رد کرتا ہے، مسلمان اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ انہوں نے اس سے سبق سیکھا۔ بات وہی کہی جو مرزا صاحب کہتے تھے لیکن الفاظ میں ذرا سی تبدیلی کر لی۔ انہوں نے کہا کہ

مزاج شناس رسول

> جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے تفقہ کی نعمت سے نوازا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرت رسول کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس سے اس کی حیثیت بالکل ایسی ہو جاتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات کو پرکھ لیتی ہے۔ . . . یہ شخص نبی اکرمؐ کا ایسا "مزاج شناس" ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت بتا دیتی ہے کہ ان میں کون سا قول یا کون سا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کون سی چیز سنتِ نبویہؐ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں معاملہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔
>
> (تفہیمات۔ حصہ اول صفحہ ۳۲۲، صفحہ ۳۲۳)

اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ جماعت اسلامی کے نزدیک یہ "مزاج شناس رسول" مودودی صاحب ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ مودودی صاحب نے کس طرح اپنے آپ کو اس مقام پر سرفراز کر لیا جس پر مرزا صاحب بیٹھے تھے۔ اب ان دونوں کے نزدیک منکر حدیث وہ ہے جو ان کی صحیح قرار دادہ حدیث سے انکار کرے۔ حتیٰ کہ جس معاملہ میں کوئی حدیث موجود نہ ہو اس میں بھی مودودی صاحب کے فیصلہ کو قولِ رسول تسلیم نہ کرے۔ مرزا صاحب یہیں تک رہے تھے اور عام معاملات میں فقہ حنفی کی پابندی کرتے تھے۔ لیکن مودودی صاحب ایک قدم آگے بڑھے۔ اور فرمایا کہ فقہی قوانین کے متعلق بھی

قرآن اور سنت کے وسیع مطالعہ اور غائر مطالعہ سے آدمی کے اندر جو اسلامی بصیرت پیدا ہوتی ہے ... اس سے وہ شرعی عمل اور طبعی عمل کے بارے میں ایک فرق کو محسوس کر سکتا ہے اور اس کا ذوق اس کو بتا دیتا ہے کہ کون سی چیز طبیعت اسلام سے تعلق رکھتی ہے اور کون سی اس سے غیر متعلق ہے۔ کون سی چیز مصالح شرعیہ کی حامل ہے اور کون سی نہیں۔ کون سی چیز اسلامی سسٹم کا ایک جزو ہے اور کون سی نہیں۔

(تفہیمات۔ حصہ دوم صفحہ ۳۳۱)

لہٰذا حدیث ہو یا فقہ، مودودی صاحب کا فیصلہ امت کے لئے قول فیصل اور حرف آخر قرار پاسکتا اور اس کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت کے مرادف بن جائے گی۔ چنانچہ ان کا ارشاد ہے کہ۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے اقامت دین کی سعی کرنے والی جماعت میں اولی الامر کی اطاعت فی المعروف در اصل اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا ایک جزو ہے۔ جو شخص اللہ کا کام سمجھ کر یہ کام کر رہا ہے اور اللہ ہی کے کام کی خاطر جس شخص نے کسی کو امیر مانا ہے وہ اس کے جائز احکام کی اطاعت کر کے در اصل اس کی نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے۔

(ہدایات۔ صفحہ ۳۷)

آپ اندازہ لگا لیجئے برادران عزیز! کہ مودودی صاحب کس مقام سے بول رہے ہیں۔ رسول اللہ کی احادیث سمٹ کر "نگہ مزاج شناس" میں آگئیں اور خدا اور رسول کی اطاعت نے اس جماعت کے امیر کی اطاعت کی شکل اختیار کر لی۔ کیا امت میں اس سے بڑا دعوی کوئی اور بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے معتقدین نے انہیں مزاج شناس رسولؐ قرار دے دیا۔ اور یہ بھی کہہ دیا کہ

ائمہ کے ہمدوش

کوئی شک نہیں کہ مودودی صاحب کی شخصیت امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے سلسلہ کی ایک کڑی ہیں۔

(فاران۔ بابت جون ۱۹۵۳ء)

اب معاملہ انتہا تک پہنچ گیا ہے اور انہیں (معاذ اللہ) "اللہ کا شاہکار" بھی قرار دے دیا گیا۔ بات یوں ہوئی کہ جب مودودی صاحب، پچھلے دنوں امریکہ سے واپس آئے تو جماعت کی طرف سے لاہور میں ان کا کس طرح استقبال کیا گیا، اس کی روداد ہفتہ وار ایشیا کی ۲۵ر اگست کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے۔

اللہ کا شاہکار

محترم اسٹیج پر سامنے تشریف فرما تھے اور نوجوان انہیں دیکھ کر نئے سے نیا نعرہ اختراع کر رہے تھے۔

اللہ کا شاہکار ـــ مودودی

اللہ کا انعام ـــ مودودی

اللہ کا احسان ـــ مودودی

...... مولانا کے چہرے پر مجبت کا رنگ چھایا ہوا تھا اور وہ خاموشی سے ان نعروں کو سن رہے تھے آخر آپ نے ہاتھ سے ان نعروں کو روکتے ہوئے فرمایا کہ مغرب کا وقت قریب ہے اس لئے مجھے کچھ باتیں کہہ لینے دیجئے۔

آپ کسی مسلمان سے پوچھئے کہ "افضل البشر" یعنی عالم انسانی میں "اللہ کا شاہکار" کون ہے تو اس کا جواب ایک ہی ہوگا کہ وہ حضور نبی اکرمؐ ہیں۔ آپؐ کے سوا جملہ کائنات انسانیہ میں "اللہ کا شاہکار" کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن مودودی صاحب کے معتقدین، خود مودودی صاحب کو "اللہ کا شاہکار" قرار دے رہے ہیں اور اس سے ان کے چہرے پر محبت کا رنگ جھلک آتا ہے۔ یا للعجب۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد شرف و مجد انسانیہ کا کوئی مقام باقی نہیں رہ جاتا۔ سامعین کو شاید یاد ہو کہ مودودی صاحب کے برادرِ کلاں، مولانا ابو الخیر صاحب نے، نیاز فتحپوری (مرحوم) کے ایک خط کے جواب میں لکھا تھا کہ ابو الاعلیٰ کے متعلق آپ کیا پوچھتے ہیں۔ وہ "تو بعد از خدا بزرگ" ہو چکے ہیں۔" (نگار ستمبر ۱۹۶۳ء) اس کے بعد مقامِ الوہیت ہی باقی رہ جاتا ہے۔ سو آگے آگے دیکھئے......

(۷)

اب رہا یہ کہ وہ مہدی موعود ہونے کا کھل کر دعویٰ کیوں نہیں کرتے تو جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے تحریک مرزائیت سے انہوں نے یہ تجربہ حاصل کیا ہے کہ نام لے کر دعویٰ کرنے کو مسلمان ہضم نہیں کرتا اس لئے خود دعویٰ نہیں کرنا چاہتے۔ انہیں علامات بتا دینی چاہئیں تاکہ وہ خود پکار اٹھیں کہ "مہدی موعود" یہ ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

مہدی موعود

> میرا اندازہ ہے کہ وہ آنے والا اپنے زمانے میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا۔ وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی۔ زندگی کے سارے مسائل مہمہ کو وہ خوب سمجھتا ہوگا۔ عقلی اور ذہنی ریاست، سیاسی تدبر اور جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکہ جما دے گا اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھ کر جدید ثابت ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی جدتوں کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان سب سے پہلے شورش برپا کر دینگے۔ پھر مجھے یہ بھی امید نہیں کہ اپنی جسمانی ساخت میں وہ عام مسلمانوں سے کچھ بہت مختلف ہوگا کہ اس کی علامتوں سے اس کو تاڑ لیا جائے۔ نہ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے مہدی ہونے کا اعلان کرے گا بلکہ شاید اسے خود بھی اپنے مہدی موعود ہونے کی خبر نہیں ہوگی، اور اس کی موت کے بعد اس کے کارناموں سے دنیا کو معلوم ہوگا کہ یہی تھا وہ خلافت کو علیٰ منہاج نبوت قائم کرنے والا جس کی آمد کا چرچا سنا گیا تھا۔
>
> (تجدید و احیائے دین)

قادیانی مہدی نے تو اپنا مشن انگریز کی حکومت کے استحکام تک محدود رکھا تھا۔ لیکن یہ آنے والا مہدی اس سے بہت آگے جانے کا عزم رکھتا ہے۔ مودودی صاحب لکھتے ہیں:

اسٹیٹ قائم کرے گا

مہدی کے کام کا جو تصور میرے ذہن میں ہے وہ بھی ان حضرات کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ مجھے اس کے کام میں کرامات و خوارق، کشوف و الہامات اور چلّوں اور "مجاہدوں" کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک "انقلابی لیڈر" کو دنیا میں جس طرح شدید جدو جہد اور کشمکش کے مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے انہی مرحلوں سے مہدی کو بھی گذرنا ہوگا۔ وہ خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہب (SCHOOL OF THOUGHT) پیدا کرے گا۔ ذہنیتوں کو بدلے گا۔ ایک زبردست تحریک اٹھائے گا جو بیک وقت تہذیبی بھی ہوگی اور سیاسی بھی۔ جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کو کچلنے کی کوشش کریگی۔ مگر وہ بالآخر جاہلی اقتدار کو الٹ کر پھینک دے گا اور ایک ایسا زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کرے گا جس میں ایک طرف اسلام کی پوری روح کارفرما ہوگی اور دوسری طرف سائنٹیفک ترقی اوجِ کمال پر پہنچ جائے گی۔ (تجدید و احیائے دین۔ صـ۳۳)

یہ اسٹیٹ کس قسم کا ہوگا۔ اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

اس نوعیت کا اسٹیٹ ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتا۔ یہ ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے۔ اس کا دائرۂ عمل پوری انسانی زندگی کو محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبہ کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی (پرسنل) نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشسٹی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھتا ہے۔

(اسلام کا نظریہ سیاسی)

قتلِ عام

مرزا صاحب نے تو مسلمانوں کو صرف دائرہ اسلام سے خارج کیا تھا۔ یہ مہدی انہیں عرصۂ حیات سے باہر نکال پھینکے گا۔ مودودی صاحب نے اس کا پروگرام بھی شائع کر رکھا ہے۔ وہ اپنی کتاب "مرتد کی سزا" میں لکھتے ہیں۔

میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو، وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کرکے ہمارے نظام اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجبات دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا۔ اور پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے

> بچایا جا سکتا ہے بچا لیا جائے۔ پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ کر پھینک دیا جائے اور اس عمل تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں۔
>
> (صفحہ ۰۰۰)

یعنی اُس اسلام پر جسے یہ حضرات اسلام قرار دیں۔ یہ ہے وہ تحریک جسے یہاں اقامتِ دین کے نام سے چلایا جا رہا ہے۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ ہمیں نہ جماعتِ اسلامی سے کوئی ذاتی پرخاش ہے نہ مودودی صاحب کی ذات سے کوئی بَیر۔ میں نے جو کچھ آپ کے سامنے پیش کیا ہے اس میں ایک لفظ اپنی طرف سے نہیں کہا۔ مودودی صاحب کی تحریریں من وعن سامنے رکھ دی ہیں۔ آپ ان سے خود اندازہ فرمائیں کہ یہ کس قسم کی تحریک ہے جو اقامتِ دین کے نام سے چلائی جا رہی ہے۔ ہماری قوم میں مذہبیت بڑی شدید ہے اس لئے مذہب کے نام پر یہ بہت جلد دامِ فریب میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ تحریکِ مرزائیت بھی مذہب ہی کے نام سے اٹھی اور یہ بھولی بھالی قوم ان کے دامِ تزویر میں گرفتار ہو گئی۔ نتیجہ یہ کہ وہ تحریک ان سے جھاڑ کی طرح لپٹ گئی اور اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ جماعتِ اسلامی کی تحریک بھی وہی انداز لئے ہوئے چل رہی ہے اور سادہ لوح مسلمان اسے نہایت معصوم سی دینی تحریک سمجھ کر اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ لیکن آپ سوچئے کہ اگر (خدا نکردہ) یہ تحریک تقویت پکڑ گئی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ تحریکِ مرزائیت کی خطرناکیاں اس کے مقابلہ میں ہیچ ہوں گی۔ طلوعِ اسلام نے ان کے تباہ کن عزائم کو شروع ہی سے بھانپ لیا تھا اور قوم کو ان سے ۱۹۳۸ء ہی میں آگاہ کر دیا تھا۔ جب اس جماعت کی عمارت کی پہلی اینٹ رکھی گئی تھی۔ اور تشکیلِ پاکستان کے بعد یہ مسلسل اسے بے نقاب کرتا چلا آ رہا ہے۔ اس سے آپ اس حقیقت کو بھی پا گئے ہوں گے کہ اس جماعت کی طرف سے طلوعِ اسلام کی اس قدر مخالفت کیوں ہوتی ہے۔ بایں ہمہ قوم کو اس خطرہ سے آگاہ کرنا ہم اپنا دینی فریضہ اور ملی تقاضا سمجھتے ہیں۔ یہی احساس میری آج کی گزارشات کا جذبۂ محرکہ بھی ہے۔ والسلام۔

(۱)

کراچی میں
ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات حاصل کرنے کیلئے
دفتر بزمِ طلوعِ اسلام کراچی سے رابطہ قائم کریں
پتہ: دارالقائد۔ ۲۰-۱/بی۔ ناظم آباد (بس سٹاپ ۴) کراچی ۱۸
فون ۶۱۴۴۶۴

مرتبہ :- چوہدری عبدالعزیز (ایم۔اے)

مختصر روئیداد
کنونشن طلوعِ اسلام

منعقدہ ۲۴ر لغایت ۲۷ر اکتوبر سنہ ۱۹۷۲ء

وقتِ مرا رداتی کوثر درآستین
بزمِ مرا طراوتِ فردوس درکنار

یوں تو جب میں گھر سے چلا ہی تو کنونشن کا سماں آنکھوں کے سامنے بندھ بندھ جاتا تھا لیکن جب ٹیکسی گلبرگ کی سرسبز و پُررونق آبادی میں داخل ہوئی تو منزل قریب آنے کے خیال سے دل ایک عجیب مسرت محسوس کر رہا تھا۔ جونہی ہم مین مارکیٹ سے تھانہ گلبرگ روڈ کی طرف مڑے تو سامنے پانی کی فوق الرأس ٹینکی پر "طلوعِ اسلام کنونشن" کے جلی اشتہارات دکھائی دیتے۔ میں نے ڈرائیور کی توجہ مبذول کراتے ہوئے اسے اُدھر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں ٹیکسی سے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ۲۵ بی۔ گلبرگ جو تحریکِ طلوعِ اسلام کا مرکز ہے، کے سامنے کے وسیع سبزہ زار میں جاذبِ نگاہ شامیانوں کا ایک عظیم ایوان ایستادہ ہے۔ ابھی میں بستر اٹھانے کی سوچ رہا تھا کہ محترم خواجہ محمد حسین صاحب جو حسبِ معمول دفترِ استقبالیہ کے انچارج تھے، اہلاً وسہلاً مرحبا کہتے ہوئے بغلگیر ہو گئے۔ کیوں نہ ہو؟ ملے ہوئے ایک سال جو گذر گیا تھا میرے کھڑے کھڑے دیگر احباب پہنچ گئے۔ خواجہ صاحب تو ادھر مصروف ہو گئے اور مجھے بزم لاہور کے کارکنان نے کیمپ میں پہنچا دیا۔ دوپہر کے کھانے سے قبل بیشتر احباب تشریف لا چکے تھے۔ پورا ماحول کیف و سرور میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوئی گلے مل رہا تھا تو کوئی حال وگذشت پوچھ رہا تھا۔ مصافحوں اور معانقوں کے لئے ہاتھ بے تابانہ اٹھ اور بڑھ رہے تھے کہ اتنے میں مفکرِ قرآن، محترم پرویز صاحب اپنے مخصوص تبسم جاں نواز کے ساتھ آتے دکھائی دیئے۔ ان کے ہمراہ ناظم ادارہ طلوعِ اسلام، محترم مرزا محمد خلیل صاحب بھی تھے۔ سبھی احباب ادھر متوجہ ہو گئے۔ محترم موصوف نے محبت بھرے انداز میں سب سے مصافحہ کیا اور انہیں کنونشن میں آمد پر خوش آمدید کہا۔

ہم ابھی اس ہما ہمی سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ مائیک پر کوئی صاحب اعلان کرتے سنائی دیئے کہ کھانا

تیار ہے اور احباب سے درخواست ہے کہ وہ طعام گاہ میں تشریف لے چلیں"۔ مجھے آواز کچھ مانوس سی معلوم ہوئی سوچا کہ چل کر دیکھوں کون صاحب ہیں؟۔۔۔ آہا! یہ تو اپنے سراج منیر صاحب ہیں جو چند ہی ماہ ہوئے لاہور تشریف لے آئے ہیں اور آجکل لاہور بزم کے نمائندہ ہیں۔ ان کا بلانا بجا تھا۔ میزبان جو ٹھہرے۔۔۔ احباب آہستہ آہستہ طعام گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے اور دروازہ پر سب کے جانے پہچانے، جناب محمد رشید صاحب جو سالہا سال سے کنونشن کی تقریب پر "قاسم رزق" چلے آرہے ہیں۔ ایک پر بہار مسکراہٹ کے ساتھ سب کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ یہ طعام گاہ محترم شیخ سراج الحق صاحب کے بنگلہ (۴۲ ربی۔ گلبرگ) میں برسہا برس سے قائم ہوتی چلی آرہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ محترم پرویز صاحب اور موصوف شیخ صاحب کی رہائش گاہیں ملحقہ بنائی ہی اس لئے گئی تھیں کہ یہاں کنونشن کے اجتماعات منعقد ہو سکیں۔ اللہ تعالےٰ اس بزرگِ تحریک کو تادیر سلامت رکھے کہ ان کے دم سے بزم میں بڑی رونق ہے۔

کھانے کے بعد بزمہائے طلوع اسلام کے نمائندگان کی ایک مختصر سی میٹنگ ہوئی جس میں آئندہ اجلاسوں میں پیش ہونے والے پروگراموں کا ایک سرسری سا جائزہ لیا گیا۔ اس کے بعد اسی مانوس آواز نے مائیک پر اراکین بزمہائے طلوع اسلام کو خصوصی اجلاس میں شرکت کی دعوت دی۔ احباب پنڈال کی طرف بڑھ رہے تھے اور میں ایک وسیع و عریض ایوان کی شان و شوکت اور حسن ترتیب کو دیکھے جا رہا تھا۔ یہ حسن ترتیب چوہدری محمد لطیف صاحب رکن بزم طلوع اسلام لاہور کے ذوق لطیف کی مرہونِ منت ہے۔ وہ ہر سال پنڈال کو ایستادہ، آراستہ و پیراستہ کرتے ہیں اور محترم افضل عابد صاحب کی کشادہ جبینی اسے بقعۂ نور بنا دیتی ہے۔ طرفہ تماشہ یہ کہ اس قصرِ رنگ و نور کی رعنائیوں میں ہر سال اضافہ ہوتا رہتا ہے۔۔۔۔ لیجئے صاحب! جلسہ کا آغاز ہوا چاہتا ہے

جمعرات ۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۲ء ۔ ۴ بجے شام

پہلا (خصوصی) اجلاس

صدارت :۔ محترم خان بخت جمال خان صاحب (صوبہ سرحد)، تلاوت :۔ محترم اخلاق احمد صاحب (جھنگ)

تلاوت قرآن مجید کے بعد نمائندہ بزم لاہور محترم سراج منیر صاحب کی طرف سے بطور میزبان استقبالیہ پیش کیا گیا۔ احباب تحریک طلوع اسلام کو کنونشن میں شرکت پر خوش آمدید کہنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے انتظامات کنونشن کے سلسلے میں اپنی کوتاہ دامنی کا اظہار کیا۔ ملک کے مختلف حصوں سے تشریف لانے والے مندوبین سے استدعا کی کہ وہ انتظامات کی اصلاح کے لئے اپنی مفید آراء سے مطلع کریں۔ نیز کیمپ میں قیام کے دوران ڈسپلن اور ضروری احتیاطی تدابیر پر کاربند رہیں۔ اس کے بعد ناظم ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے سالانہ رپورٹ اجلاس میں پڑھ کر سنائی گئی جس میں "تحریک" کی گرمیٔ عمل اور تیزیٔ رفتار کے ساتھ ادارہ کی مجبوریوں اور معذوریوں کا بھی اعتراف تھا۔ مندوبین سے درخواست کی گئی کہ وہ درج ذیل امور کے لئے اپنا تعاون پیش کریں۔

(ا) مجلہ طلوعِ اسلام کی اشاعتی اسکیم۔ (ب) اشاعتِ کتب۔ (ج) ٹیپ ریکارڈ پر دروسِ قرآن مجید۔
(د) محترم پرویز صاحب کے دوروں کا پروگرام۔ (ہ) پمفلٹ اسکیم۔

آخر میں ناظم ادارہ نے احباب طلوعِ اسلام کی لاہور تشریف آوری اور فکرِ قرآنی سے دلی لگن پر انہیں مبارک باد دی۔ بزمِ لاہور کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی طرف سے میزبانی کے فرائض کی ادائیگی کی ذمہ داری قبول کی گئی۔ . . . اجلاس برخاست ہونے سے قبل نمائندہ بزمِ لاہور نے اعلان کیا کہ دوسرا (کھلا) اجلاس شام چھ بجے شروع ہوگا۔

احباب تحریک کے مختلف مسائل پر سوچتے پنڈال سے نکلے اور چائے کی ایک پیالی کے لئے ٹی سٹال کی طرف بڑھنے لگے۔ یہ سٹال ہر سال بزمِ لاہور چھاؤنی کے معزز رکن جناب مقصود احمد بٹ صاحب لگاتے ہیں اور اپنے رفقاء کے ہمراہ ہر لحظہ احباب کی خاطرداری کے لئے موجود ملتے ہیں۔ ابھی ٹی سٹال کی طرف قدم اٹھانے ہی والا تھا کہ محترم پرویز صاحب چند احباب کے جلو میں ادھر آتے دکھائی دیئے۔ معلوم ہوا کہ بزمِ کراچی نے حسبِ سابق ایک سٹال لگا رکھا ہے جس میں تحریکِ طلوعِ اسلام کے مقاصد، پروگرام اور قرآنی تعلیم کے اہم مقامات چارٹوں اور نقشوں کی صورت میں آویزاں کئے ہوتے ہیں۔ محترم موصوف نے اس کا افتتاح فرمایا اور احباب نے دیکھا کہ نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی محترم محمد اسلام صاحب اور ان کے رفقاء نے کس قدر محنت سے تحریکِ طلوعِ اسلام کی تاریخ اور قرآنی تعلیم کو موزوں ترین انداز میں پیش کیا ہے۔

شام کے چھ بج رہے تھے۔ مائیک سے اجلاس کے شروع ہونے کا اعلان ہوا۔ ہم جلدی سے کیمپ سے باہر آئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ بجلی کے قمقموں اور فانوسوں سے پنڈال سیلابِ نور بنا ہوا ہے۔

جمعرات۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۴ء۔ چھ بجے شام

دوسرا (کھلا) اجلاس

صدارت:۔ ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب۔ ، تلاوت۔ حافظ عبدالمجید صاحب۔ (پنڈدادنخان)
کلامِ اقبال۔ محترم عبدالغفور صاحب۔ (کراچی)

سٹیج سیکرٹری سراج منیر صاحب نے سامعین کے اضطراب اور منتظر نگاہوں کو بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اب محترم پرویز صاحب آپ سے خطاب فرمائیں گے۔ شرکائے مجلس کی نگاہیں سامنے جمی ہوئی تھیں۔ گردوپیش سے بے خبر، ہمہ تن گوش استقبالیہ خطاب سن رہے تھے۔ "بانیٔ تحریک" نے سب سے پہلے تو حسبِ معمول "مہمانانِ حبادہ شوق" کو اپنے مخصوص انداز میں خوش آمدید کہا۔ ان کے ایثار و قربانی کے انداز جنوں کو یوں بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا کہ

عشق میں ایک تم ہمارے ہو باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

آپ نے ملک کے موجودہ حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے پُرامید لہجہ میں کہا کہ "تحریکِ احمدیت" سے وابستہ افراد کو "غیر مسلم اقلیت" قرار دینے کا حکومتی فیصلہ قرآنی احکام کی حکمرانی کی طرف ایک انقلابی اقدام

ہے جس سے اتنا تو ثابت ہو ہی گیا کہ اسلام بحیثیت "دین" افراد کے کفر و ایمان" کے فیصلے نافذ کرنے کا اختیار قانونی طور پر صرف حکومت کو دیتا ہے۔ اس میں مذہبی پیشوائیت کی دخل اندازی کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جا سکتا۔ (یہ استفتاء طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۷۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔)

محترم پرویز صاحب کے خطاب کے بعد بزم لاہور کے فاضل رکن جناب محمد احمد صاحب ایڈووکیٹ نے ایک قرارداد کا مسودہ پڑھ کر سنایا جس میں حکومتِ پاکستان کے "احمدیت" سے متعلق حالیہ فیصلہ پر اسے مبارکباد پیش کی گئی تھی۔ اور یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ اس سلسلہ میں "ضروری قوانین" جلد از جلد وضع کرے تاکہ عملی مشکلات کا ازالہ ممکن ہو۔ اجلاس نے یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور کر لی۔ اس کے بعد محترم محمد اسلام صاحب اسٹیج پر تشریف لائے اور انہوں نے "احمدیوں" کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کے بارے میں محترم پرویز صاحب کی خدمات کا تذکرہ کیا اور ان کے اعتراف کے طور پر جو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا اس کا عملی مظاہرہ یوں ہوا کہ احباب کی طرف سے موصوف ہی کا ایک "پورٹریٹ" ان کی خدمت میں پیش کیا گیا جس کی نقاب کشائی بڑی ہی پُرکیف تھی۔ یہ پورٹریٹ ملک کے مایہ ناز فوٹوگرافر اور مصور محترم نذیر صاحب (حیدرآباد سندھ) کے موئے قلم کا شاہکار تھا۔

جمعرات ۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۴ء ۔ بوقت ۱۰ بجے شب

تیسرا (خصوصی) اجلاس

صدارت: محترم نذیر احمد خاں صاحب (کوئٹہ) ؛ تلاوت: حافظ عبدالمجید صاحب

اس اجلاس میں بزم ہائے طلوعِ اسلام کے نمائندگان نے اپنی اپنی بزموں کی سالانہ کارگزاری کی مختصر رپورٹیں پیش کیں۔ چونکہ اس قرآنی تحریک میں کہیں بھی تصنع اور تکلف سے کام نہیں لیا جاتا اس لئے احتسابِ خویش کے اس مرحلہ میں کئی چہرے سرخرو نظر آئے تو کئی ایک کی پیشانی "عرقِ انفعال" سے تر دیکھی گئی۔ امسال بھی حسبِ سابق "بزم کراچی" کے پارلیمنٹری پروگرام نے محفل کو جا لیا۔ جبکہ چند ایک دوسری بزموں کی کارروائی "محوِ تماشا [illegible]" سے زیادہ نہ رہی۔ اس اجتماع میں "سامانِ سفر" کی کم مائیگی کا تو اراکین بزم ہائے طلوعِ اسلام کو احساس رہا۔ لیکن "احبابِ کراچی" کی "طاقتِ استغنا" نے انہیں پکار پکار کر کہا کہ ؎

بحر کہ جوشے آب چہ مستانہ می رود

محنت اور لگن سے مسائل حل کرنے سے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں۔ اس اجلاس کی خاصیت یہ بھی تھی کہ بزموں کے سامنے جو پروگرام تھا وہ اگرچہ جاں گسل ہے لیکن وہ اس سے بچیں گے کیونکہ ان کی تعلیم کا مرکزی نقطہ یقینِ محکم اور عملِ پیہم ہے۔ نصف شب کا عمل ہو گا کہ احباب استراحت کے لئے قیام گاہ کی طرف پلٹے۔

جمعہ ۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۴ء ۔ بوقت ۹ بجے صبح۔

چوتھا (خصوصی) اجلاس

صدارت :- محترم محمد اسلام صاحب (کراچی)　　تلاوت :- محترم محمد ظہیر الدین صاحب (کوئٹہ)
کلامِ اقبال :- مرزا محمد خلیل صاحب (لاہور)

محترم مرزا محمد خلیل صاحب، جو قافلۂ فکرِ قرآنی کے "السابقون الاولون" میں سے ہیں اور جنہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ اس کے "حدی خواں" ہیں، نے کلامِ اقبال سے حسبِ ذیل انتخاب پیش فرمایا۔

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے

ان کی آواز میں وہ سوز تھا کہ احباب جھوم جھوم گئے۔ ازاں بعد اسٹیج سیکرٹری کی طرف سے ایک ایک کر کے "تحریکِ طلوعِ اسلام" کے فروغ کے سلسلے میں چند اہم امور کے بارے میں اراکین بزمہائے طلوعِ اسلام سے مشورہ لیا گیا۔ نہ صرف مشورہ لیا گیا بلکہ انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے حصولِ تعاون میں بھی کامیابی ہوئی۔ یہ نہایت خوش آیند علامت ہے۔

جمعہ - ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۴ء - بوقت ۲½ بجے بعد دوپہر۔

پانچواں (کھلا) اجلاس

صدارت :- محترم میاں ظفر احسن محمود صاحب ایڈووکیٹ۔　　تلاوت :- محترم محمد ظہیر الدین صاحب۔

"تلاوتِ کلامِ پاک کے بعد مختلف موضوعات پر قرآنی تعلیمات سے متاثر و متمسک حضرات کی طرف سے نہایت پُر مغز اور سنجیدہ مقالات بہ ترتیب ذیل پیش کئے گئے۔

(۱) جناب ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب سب سے پہلے تشریف لائے۔ آپ نے ہمارے ملکی و قومی مسائل پر جس اچھوتے انداز سے اظہارِ خیال فرمایا وہ انہی کا حصہ ہے۔ آپ کا اندازِ بیان سادگی و پرکاری کا حسین امتزاج تھا۔ عام محسوس ہونے والے مسائل مرکزِ نگاہ بن گئے۔ قیامِ پاکستان اور اس کے بعد کی قومی لغزشوں کا تذکرہ عبرت و موعظت کی تصویر تھا۔ سامعین کو شدید طور پر احساس ہوا کہ

ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

کی تلخ حقیقت برداشت سے باہر ہے۔ آخر میں آپ نے مدلل انداز سے تاریخی شواہد کی روشنی میں "دو قومی نظریہ" کو استحکامِ ملت کا بنیادی پتھر قرار دیا۔

(ب) محترم محمد اسلام صاحب، فکرِ قرآنی کے وہ بیباک اور نڈر علمبردار ہیں جن کی شخصیت اب کسی کے لئے بھی محتاجِ تعارف نہیں۔ انہوں نے "طلوعِ اسلام تحریک" پر مخالفین کی طرف سے عاید کردہ بے بنیاد الزامات کا ایک ایک کر کے پردہ چاک کیا اور حقیقتِ حال کی ایسی واضح تصویر پیش کی کہ سامعین نے تحریکِ قرآنی کو اپنی اصلی اور پاکیزہ شکل میں دیکھ لیا۔ (موصوف کا یہ مقالہ طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۷۴ء میں شائع ہو چکا ہے)

(ج) محترم چوہدری عطاء اللہ صاحب ایڈووکیٹ ساہیوال تشریف لائے اور "گر تو بُرا نہ مانے" کے عنوان سے مختلف امور پر روشنی ڈالی۔ آپ نے نہایت حسین وسادہ و رنگین انداز سے "مجاورانِ حریمِ پاک" کی غلط روش

پر گرفت کی۔ موصوف نے ارباب اختیار کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں مشورہ دیا کہ وہ "مسائل ملی و ملکی" کی شب تاریک سے نجات پانا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ قرآن مجید سے کسب ضیا کریں۔ اس کے بغیر "پریشانیٔ احوال کا مداوا ممکن نہیں ہے۔

وقت کی قلت کے سبب محترم حسن عباس رضوی صاحب کا مقالہ "زمین کے ہنگامے" پیش نہ ہو سکا۔ لیکن اسے طلوع اسلام بابت نومبر ۱۹۷۴ء میں شائع کر دیا گیا ہے)

آخر میں محترم میاں ظفر احسن محمود صاحب، صدر جلسہ نے اپنے تأثرات کو یہ کہہ کر سمیٹ لیا کہ چونکہ آئندہ اجلاس "مجلس استفسارات" کے لئے وقف ہے اور سامعین کو تازہ دم ہونے کے لئے وقفہ درکار ہے۔ لہٰذا یہ اجلاس برخاست کیا جاتا ہے۔ یعنی

آگے بڑھیں گے دم لے کر

جمعہ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۷۴ء، چھ بجے شام

چھٹا (کھلا) اجلاس

(مجلس استفسارات)

اس اجلاس میں بانیٔ تحریک محترم پرویز صاحب نے سامعین کی طرف سے زندگی کی عملی ضرورتوں سے متعلق پیش کردہ سوالات کے جوابات قرآن مجید کی روشنی میں ایسی برجستگی سے دیئے کہ روح بصیرت وجد میں آ گئی۔ اس بزم کا انداز نہایت شگفتہ، مؤثر اور مسکت ہوتا ہے۔ آج بھی حسب معمول یہ انداز پوری نشست میں برقرار رہا۔ بالآخر تقریباً ۹ بجے جب یہ مجلس برخاست ہوئی تو ہر شخص یوں شگفتہ و شاداب اور مطمئن دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ تین گھنٹے کے بعد کسی نئی دنیا سے حیات تازہ لے کر لوٹا ہو۔ مفکر قرآن محترم پرویز صاحب کی قرآنی محفلیں فی الحقیقت حیات نو کی پیامبر ہوتی ہیں۔

ہفتہ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۷۴ء بوقت ۹ بجے صبح

ساتواں (خصوصی) اجلاس

صدارت:۔ جناب اقبال سرور صاحب (ملتان)۔ تلاوت:۔ حافظ محمد یونس صاحب

کلام اقبال۔ محترم میرزا محمد خلیل صاحب۔

اس اجلاس میں تحریک طلوع اسلام کو پیش آمدہ مشکلات کا جائزہ لیا گیا اور احباب کے مشورہ سے ان کا حل سوچا گیا۔ اس مجلس میں یہ نشید جاں فزا بھی وجہ بالیدگیٔ قلب و دماغ ہوئی کہ پرویز صاحب گزشتہ دس سال سے جس تبویب القرآن کی ترتیب و تدوین میں مصروف تھے، اللہ کے فضل و کرم سے اس کا مسودہ مکمل ہو گیا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

ہفتہ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۷۴ء بوقت ۲½ بجے بعد دوپہر

آٹھواں کھلا اجلاس

(بزم مذاکرہ)

صدارت ۔ جناب شیخ سراج الحق صاحب ، تلاوت ۔ محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ
سٹیج سیکرٹری ۔ محترم پرویز صاحب

اس اجلاس کی اہمیت اور خصوصیت اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اس میں اسٹیج سیکرٹری کے فرائض جناب پرویز صاحب خود سرانجام دیتے ہیں جیسا کہ گذشتہ سالوں سے معمول رہا ہے اس میں تحریک سے وابستہ اور متاثرہ نوجوان طلبہ اور طالبات کے علاوہ اساتذہ اور ماہرین تعلیم بھی اظہارِ خیال کرتے ہیں ۔ امسال بزم مذاکرہ کا موضوع تھا ۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

جدید نظام تعلیم کی خرابیوں کے چلتے پھرتے نشانات مذاکرہ سننے کے بعد ابھر کر سامنے آ گئے ۔ اصلاحِ احوال کے لئے ہر زبان یہی پکار رہی تھی کہ

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی		علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

پروگرام لمبا ہونے کے باعث دو نشستوں میں سمٹایا جا سکا ۔

کنونشن کے روز اول جب محترم پرویز صاحب کو ان کا پورٹریٹ پیش کیا گیا تو احباب نے اس شاہکار سے متاثر ہو کر باصرار اس آرٹسٹ کے متعلق پوچھا جس نے اسے تخلیق کیا ہے ۔ اُس وقت وہ صاحب موجود نہ تھے ۔ اُنکے آنے کی توقع تھی ۔ یہ اجلاس قریب الاختتام تھا کہ محترم نذیر احمد صاحب جنہوں نے اس قدر محنت سے اسے تیار کیا تھا ، حیدر آباد سے تشریف لے آئے ۔ چنانچہ محترم میرزا محمد خلیل صاحب نے ان کا تعارف یہ کہتے ہوئے کرایا کہ وہ فوٹوگرافی اور پورٹریٹ سازی میں تیس سالہ تجربہ رکھتے ہیں اور انہوں نے قائداعظمؒ کا بھی ایک شایانِ شان پورٹریٹ بنایا ہے ۔ جب وہ پرویز صاحب کے پورٹریٹ کے پہلو میں کھڑے ہوئے تو سامعین نے مسرت میں تالیاں بجائیں ۔ اس کے بعد اعلان ہوا کہ جو اصحاب گذشتہ کنونشنوں کی فلم دیکھنا پسند کریں وہ اجلاس کے بعد تشریف رکھیں ۔ یہ فلم بزم ملتان کے ایک معزز رکن جناب یوسف ضیاء صاحب نے تیار کی تھی ۔ وہ ہر سال اپنے جدید ترین کیمروں کے ساتھ شریک کنونشن ہوتے ہیں اور ہر کارکے گروپ فوٹو اور کنونشن کے جستہ جستہ واقعات کی فلم تیار کر کے اسے دوام عطا کرتے ہیں ۔

اتوار ۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۲ء ۔ بوقت ۱۰ بجے صبح

نواں (کھلا) اجلاس

صدارت ۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) جناب محمد نواز ملک صاحب ۔		تلاوت : حافظ محمد یونس صاحب ۔

کلام اقبالؒ :- میجر جنرل (ریٹائرڈ) محترم احسان الحق صاحب ۔
اسٹیج سیکرٹری محترم سراج منیر صاحب مائیک پر آئے اور انہوں نے کہا
"مرزائیت کے نقشِ قدم پر ۔۔۔ لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک"

مجھ سمیت میرے اردگرد بیٹھے جملہ سامعین چونک سے گئے اور سمندِ خیال کنوتیاں بدل بدل کر نیز تیز دوڑنے لگا۔ لیکن منزل کو پہچان نہ سکا۔ سکتہ کے اس عالم کو انہوں نے یہ اعلان کر کے توڑا کہ محترم محمد اسلام صاحب نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی بتائیں گے کہ وہ کون ہے جو مرزائیت کے نقشِ قدم پر جا رہا ہے اور کس طرح اس سے زیادہ خطرناک ہے؟ موصوف اسٹیج پر تشریف لائے اور اپنے مخصوص انداز میں مرزائیت اور اس جدید جماعت کے مقاصد، پروگرام، لائحہ عمل، خیالات، نظریات اور نقابات کی یکسانیت کو دونوں کی کتب کے حوالوں سے پیش کرتے چلے گئے۔ جب انہوں نے اس تقدس مآب جماعت کے چہرے سے نقاب نوچا تو سب نے دیکھا کہ یہ لیلئے عمل، جماعتِ اسلامی ہے۔ اس پردہ دری پر بہت سے لوگ متعجب تھے اور بہت سے چیں بہ جبیں۔ اسے بھانپتے ہوئے مقرر موصوف نے فرمایا کہ انہوں نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی۔ جو کچھ کہا ہے متعلقہ دونوں جماعتوں کی کتابوں کے حوالہ سے کہا ہے۔ جسے شک ہو اسے حوالہ سے ملا کر دیکھ لے۔ چونکہ یہ خطاب طلوعِ اسلام میں چھپ جائے گا اس لئے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ابھی سامعین اس تعجب خیز انکشاف کی حیرت گرفتاری سے نہ نکلے تھے کہ محترم پرویز صاحب کے خطاب کا اعلان ہوا۔ عنوان تھا "فرد مملکت کے لئے ہے یا مملکت فرد کے لئے؟"

محترم پرویز صاحب باوقار مسکراہٹ کے ساتھ اسٹیج پر تشریف لائے اور اپنے مخصوص انداز میں سلام وتسمیہ کے بعد یوں گویا ہوئے "اصل مقصود کیا ہے؟ ۔۔۔ فرد یا مملکت" بعد ازاں محترم موصوف نے انسان کی ابتدائی زندگی سے لے کر جدید دور تک کے نظریاتِ حکومت کا ایک اجمالی خاکہ کھینچا اور مملکت کی حقیقت کو عیاں کیا۔ مملکت کے تجریدی تصور کو جس طرح تشبیہات کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے اس کا پردہ چاک کیا۔ انہوں نے برگساں کے ان الفاظ کو بھی پیش فرمایا جس میں اس نے کہا تھا کہ "مملکت کا اقتدار انسانوں پر نہیں، چیزوں پر ہونا چاہیئے (اور وہ بھی اس طرح کہ) کسی انسان کا دوسرے انسان پر کوئی اقتدار نہ رہے"۔ اس کے بعد انہوں نے بالصراحت بتایا کہ قرآن کریم اس بارے میں کیا راہنمائی دیتا ہے۔ صاحبِ موصوف نے ختمِ نبوت کو محض ایک اعتقادی مسئلہ کی بجائے منشورِ آزادی قرار دیا اور قرآن کریم کی متعدد آیات سے استدلال کر کے بتایا کہ فرد جماعت کے ساتھ صرف ربط رکھتا ہے، اس میں جذب و فنا نہیں ہو جاتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں،

فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند	سلک و گوہر کہکشان و اختر اند
فرد می گیرد ز ملت احترام	ملت از افراد می یابد نظام

نیز یہ کہ

زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است	اے کہ در قافلہ! بے ہمہ شو با ہمہ رو

انہوں نے وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی (۶/۹۵) اور وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ ۔ (۱۷/۷۰) سے استدلال

کرتے ہوئے فرمایا کہ

برتر از گردوں مقامِ آدم است　　　　اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

جس معاشرہ یا نظام میں، فرد کے شرف اور احترام پر ذرا سی بھی زد پڑتی ہو وہ انتہائی مردود و ملعون ہے ... شاید میں اس قدر اہم اور پُرمغز مقالہ کا ہلکا سا تعارف بھی آپ سے نہیں کرا سکا۔ امید ہے یہ مقالہ طلوع اسلام میں چھپ جائے اور نگاہِ شوق کی تسکین کا سامان فراہم کرے گا۔

احباب ابھی محترم پرویز صاحب کے مقالہ کے اہم مقامات کو یادداشت میں محفوظ کر رہے تھے کہ محترم محمد اسلام صاحب (کراچی) اسٹیج پر تشریف لائے اور ایک قرارداد پیش کی جس میں نظریۂ پاکستان کی تشریح کے بعد اسے قانونی حیثیت دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد حافظ محمد یونس صاحب (لائل پور) تشریف لائے اور ایک قرارداد میں دو قومی نظریہ کی اہمیت کے تذکرہ کے بعد اسے آئینی اور قانونی حیثیت دینے کا مطالبہ کیا۔ اس کے بعد مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب خود مائیک پر تشریف لائے اور ایک قرارداد پیش کرنا چاہی۔ لیکن قرارداد سے قبل انہوں نے بتایا کہ کسی مملکت میں مذہبی امور کا شعبہ کس طرح اس کے سیکولر ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے تقسیم ہند سے قبل کے بعض امور پس منظر کے طور پر بیان کئے اور اپنی وہ قرارداد پیش فرمائی جو چند صفحات کے بعد (دیگر قراردادوں کے ساتھ) پوری کی پوری آپ کے سامنے آئے گی۔ اس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا ....

کہ وہ مذہبی امور کی وزارت کا الگ قیام ختم کر دے اور مروجہ آئین پاکستان میں کی گئی وضاحت کے مطابق پوری کی پوری مملکت کو اسلامی بنانے کے لئے عملی اقدامات کرے جس کا طریق یہ ہے کہ وہ جملہ امورِ مملکت کا فیصلہ قرآنِ مجید کی روشنی میں کرتی چلی جائے۔

حاضرین نے پُرجوش تالیوں کے ساتھ ان قراردادوں کا خیر مقدم کیا اور بالاتفاق انہیں پاس کر دیا۔

اتوار ۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء ۔ بوقت ½۲ بجے بعد دوپہر

دسواں (خصوصی) اجلاس

صدارت :۔ محترم میرزا محمد خلیل صاحب　　　　تلاوت :۔ حافظ محمد یونس صاحب۔

کلامِ اقبال :۔ میرزا محمد خلیل صاحب۔

تحریکِ طلوعِ اسلام کی مشکلات کا جائزہ لینے اور ان کا حل تلاش کرنے کے سلسلے میں بزموں کا یہ آخری اجلاس تھا۔ اکثر امور اس سے قبل کے اجتماعات میں طے پا چکے تھے۔ جو باقی تھے وہ بھی بااحسن طریق نمٹ گئے۔ اس کے بعد چند اراکین کی طرف سے قراردادیں پیش ہوئیں جو بالاتفاق منظور کی گئیں (انہیں روئیداد کے آخر میں درج کیا جا رہا ہے) چونکہ بزموں کا اس کے بعد کوئی دوسرا اجلاس نہیں تھا اس لئے محترم پرویز صاحب نے اسی جلسہ میں احباب کو الوداعی پیغام دینا مناسب سمجھا۔ انہوں نے گزشتہ سالوں کے ساتھ اس سال کا تقابل کر کے بتایا کہ تحریک کی گاڑی اب دلدل (کھوبے) سے نکل گئی ہے۔ اس لئے احباب کی وہ صلاحیتیں جو زیادہ تر مزاحمت کے کلنٹے ہٹانے میں صرف ہوتی تھیں اب تعمیری پروگرام کے لئے وقف ہونی چاہئیں۔ انہوں نے بزموں کے تنظیمی

معاملات میں بھی راہنمائی دی۔ اور خصوصاً فرقہ بندی کی لعنتوں اور علامتوں سے احتراز کرنے کے لئے کہا۔ اس سلسلے میں انہوں نے فرقہ اہل قرآن کا تذکرہ فرمایا کہ دین کی کنہ وحقیقت کے سمجھنے میں ان کی ناش غلطی نے قرآنی تحریک کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے اور بالخصوص ان سے مجتنب رہنے کی تاکید کی۔

اتوار - ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء - بوقت چھ بجے شام

گیارہواں (کھلا) اجلاس

صدارت:- چوہدری عطاء اللہ صاحب ایڈووکیٹ۔ تلاوت:- حافظ عبدالمجید صاحب

محترم حافظ صاحب نے سورۃ یوسف کے اس حصہ کو تلاوت کے لئے منتخب فرمایا تھا جس کا تعلق آج کے موضوع سے تھا اور ان آیات میں اس وقت کی اور آج کی پوری جنسی کیفیت جھلمل جھلمل کرتی نظر آرہی تھی۔ تلاوت ومفہوم کے بعد محترم پرویز صاحب نے کنونشن کے اس آخری اجلاس سے "جنسی بدنہادی کا قوموں کی موت و حیات پر اثر" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ انہوں نے بتایا کہ فحاشی کے جس گرداب میں اس وقت ساری دنیا پھنس رہی ہے۔ اس کے اسباب کیا ہیں اور اس میں ہماری شاعری اور مذہب کی بعض بظاہر "تقدس مآب" ہستیوں کے "فتاویٰ شریفہ" کا کس قدر عمل دخل ہے۔ انہوں نے بالخصوص سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن اور کتاب رسائل ومسائل کے بعض اقتباسات پیش فرمائے اور پھر حاضرین سے پوچھا کہ بتلایئے جس معاشرہ میں اس قسم کی شاعری، اس طرح کی تعلیم اور اس انداز کی مذہبی سندیں پیش کی جارہی ہوں اس میں فحاشی عام نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا؟ کیا پارسائی عام ہوگی؟ . . . . اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ جنسی اختلاط کے نتائج وعواقب ایک فرد یا ایک جوڑے تک محدود نہیں ہوتے اور یہ محض ایک پرائیویٹ معاملہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق قوموں کے عروج وزوال سے ہے۔ انہوں نے اس ضمن میں فرائڈ اور ڈاکٹر اَن وِن کی تحقیق پر پُر از معلومات بحث کی اور بتایا کہ قرآنِ کریم نے کس طرح اس الجھے ہوئے مسئلہ کو حل کیا ہے۔ چونکہ محترم موصوف کا یہ مقالہ طلوع اسلام میں چھپے گا، اس لئے میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

اتوار کی شب کنونشن کا آخری اجلاس اختتام پذیر ہو رہا تھا۔ اور سامعین، جن میں اراکین بزمہائے طلوع اسلام اور دور ونزدیک سے آنے والے شائقین شامل تھے، پنڈال سے باہر بک سٹال کا رُخ کر رہے تھے جہاں حسبِ معمول محترم شیخ عبدالحمید صاحب اور جناب عارف بٹالوی صاحب نہایت خاموشی اور تندہی سے احباب کی فرمائشوں کے مطابق انہیں کتب اور پمفلٹ فراہم کر رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں اصحاب کی ڈیوٹی بڑی ہی سخت واقع ہوئی ہے۔ جو رات گئے تک جاری رہتی ہے۔

لیجئے صاحب! رات ہوتی ہے۔ احباب اب استراحت فرمائیں گے اور صبح رخصت۔ روانگی کا نقشہ میں نہ کھینچ سکوں گا۔ خدا حافظ!

(٥)

بقیہ قراردادیں صفحہ ۸ سے مسلسل

قرارداد نمبر ۳

مملکتِ پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد نظریۂ پاکستان پر رکھی گئی تھی۔ اس نظریہ کے الفاظ تو یہاں بکثرت دہرائے جاتے ہیں لیکن اس کا مفہوم آج تک متعین نہیں کیا گیا۔ اس کا مفہوم قرآن مجید کی ایک آیت میں سمٹ کر آ گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں)

اس حقیقتِ کبریٰ کو قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ نے ان زندۂ جاوید الفاظ میں بیان کیا تھا:

"اسلامی حکومت کے تصوّر کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا تعالیٰ کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔"

عملی حیثیت سے اس نظریہ کے نفاذ کے معنی یہ ہیں کہ مملکت کے جملہ امور ان حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دئے جائیں، جنہیں قرآنِ کریم نے متعیّن کیا ہے اور ملک کا کوئی ایسا قانون، جائز قانون قرار نہ دیا جائے جو قرآنِ کریم کے کسی حکم، اصول یا تعلیم کے خلاف ہو۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ حکومت کے جس اقدام، فیصلہ یا قانون کے متعلق کسی کو شکایت ہو کہ وہ قرآن مجید کے خلاف ہے، اس کے لئے وہ مملکت کی عدالتِ عالیہ (سپریم کورٹ) کی طرف رجوع کر سکے اور اس عدالت کا فیصلہ قولِ فیصل قرار پائے۔

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس مرکزی حکومت پاکستان سے استدعا کرتا ہے کہ وہ نظریۂ پاکستان کی مذکورہ صدر تشریح و تعبیر کو آئینی اور قانونی حیثیت دے کر اسے ملک میں عملاً نافذ کرے اور اس نظریہ کی کسی دوسری تعبیر، یا اس کی قولی و فعلی مخالفت کو قانوناً جرم قرار دے۔

قرارداد نمبر ۴

مملکتِ پاکستان کی عمارت دو ستونوں پر استوار ہوئی ہے۔ نظریۂ پاکستان اور دو قومی نظریہ۔ دو قومی نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام ہی تشکیلِ قومیت کا معیار دین کا اشتراک ہے نہ کہ وطن کا اشتراک۔ اسی بنا پر مملکت کی حدود میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد قرار نہیں پا سکتے۔ وہ دو مختلف اور جداگانہ قومیں ہوتے ہیں۔ پاکستان میں دو قومی نظریہ کے الفاظ تو دہرائے جاتے ہیں لیکن آج تک اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ یہاں اشتراکِ وطن کی بنیاد پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک ہی قوم تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ اسلام کی بنیادی تعلیم کے بھی خلاف ہے اور اس بنیاد کے بھی خلاف جس پر اس مملکت کی عمارت استوار ہوئی ہے۔ اسلام کی رُو سے مملکتِ پاکستان میں غیر مسلموں کو ضروری تحفظات تو حاصل ہوتے ہیں لیکن وہ امورِ مملکت اور قانون سازی کے معاملات میں شریک نہیں

نہیں کئے جا سکتے۔ جہاں تک مسلم قوم یعنی امتِ مسلمہ کا تعلق ہے۔ اس کے اندر مختلف قومیتوں کا تصور بھی خلافِ اسلام ہے۔

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس حکومتِ پاکستان سے استدعا کرتا ہے کہ وہ پاکستان میں "دو قومی نظریہ" کو آئینی اور قانونی حیثیت دے کر اس مقصد کے حصول کی طرف عملی قدم اٹھائے جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا، اور جو قرآنِ عظیم کا بنیادی مطالبہ ہے۔

وہ قراردادیں جو بزموں کے خصوصی اجلاس مورخہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۴ء میں منظور ہوئیں

قرارداد نمبر ۱

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس تمام شرکائے کنونشن اور خصوصی طور پر ان بزم ہائے طلوعِ اسلام کے اراکین و معاونین کا شکر گزار ہے جو نامساعد حالات میں بھی کنونشن میں حسبِ معمول شریک ہوئے، اور اُسے کامیاب بنانے میں ہر ممکن تعاون کیا۔

قرارداد نمبر ۲

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس محترم شیخ سراج الحق صاحب کا بخلوصِ قلب سپاس گزار ہے کہ موصوف نے کرم فرمائی سے کام لیتے ہوئے اپنے بنگلہ کا ایک حصہ مندوبین کنونشن کے قیام و طعام کے لئے کنونشن کمیٹی کی تحویل میں دے دیا اور اس طرح ان کے لئے قابلِ قدر سہولت فراہم کر کے کنونشن کو کامیاب بنانے میں معاونت فرمائی۔

قرارداد نمبر ۳

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ سالانہ اجلاس بزمِ طلوعِ اسلام راولپنڈی کے ممتاز رکن ملک ظہور احمد صاحب کا بخلوصِ قلب شکر گزار ہے کہ انہوں نے مسلسل جانفشانی اور عرق ریزی سے مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کے ٹیپ پر ریکارڈ شدہ درسِ قرآنِ حکیم کو ضبطِ تحریر میں لانے کی ساعیٔ جمیلہ کو مستقل مزاجی سے اب تک جاری رکھا ہے۔ کنونشن کا یہ اجلاس موصوف سے بجا طور پر یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اس کارِ فیض کو آئندہ بھی جاری رکھیں گے۔

قرارداد نمبر ۴

تاریخ ہی کسی شخصیت یا تحریک کا بہترین سرمایہ ہوتی ہے اور اسے محفوظ کرنے والا قابلِ صد تحسین و آفرین۔ بزم طلوعِ اسلام کراچی اور بالخصوص اس کے فعال و جواں ہمت نمائندہ محترم محمد اسلام صاحب نے جس طور پر سال ہا سال سے تحریکِ طلوعِ اسلام کے ریکارڈ کو مرتب کر کے کنونشن کے سالانہ اجتماعات میں اپنے خصوصی سٹال پر اسے کتبوں کی صورت میں (EXHIBIT) کرنے کی مبارک سعی جاری رکھی ہے وہ اپنے حسنِ معانی اور صورتِ جمیل

میں اپنی مثال آپ ہے۔ مزید یہ کہ اسٹیج کی آراستگی میں جو جدت انہوں نے پیدا کی ہے اس کے لئے جملہ مندوبین کنونشن ان کے بصمیم قلب شکرگزار ہیں اور ان مساعئ جمیلہ کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں۔

قرارداد نمبر ۵

طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن کا یہ اجلاس بزمِ طلوعِ اسلام لاہور، بزمِ طلوعِ اسلام ملتان اور بزمِ طلوعِ اسلام لائل پور کا بالخصوص اور دیگر بزموں کا بالعموم شکرگزار ہے کہ انہوں نے باہمی تعاون اور یگانگت سے طلوعِ اسلام کنونشن کے انعقاد کے اخراجات برداشت کرکے اس کو کامیاب بنانے میں قابلِ قدر خدمت انجام دی۔ یہ اجلاس بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کا خصوصی طور پر شکرگزار ہے کہ انہوں نے ملک کے طول و عرض سے آنے والے مندوبین کے قیام و طعام کے سلسلے میں ہر ممکنہ سہولت فراہم کی۔

"ختمِ نبوّت اور تحریکِ احمدیّت"

پرویز

★ مسئلہ قادیانیت کا قانونی فیصلہ تو ہوگیا ہے لیکن ذہن ابھی تک اس کے متعلق صاف نہیں ہوئے۔

★ ذہن صاف نہیں ہو سکتے جب تک یہ نکات واضح نہ ہوں کہ نبوت کا مقام کیا ہے۔ نبی کہتے کسے ہیں۔ ختمِ نبوت کا عملی مفہوم کیا ہے۔ "تحریکِ احمدیت" کے محرکات کیا تھے۔ یہ تحریک مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھی۔ مرزا غلام احمد کس طرح بتدریج اپنے آخری دعوے تک پہنچے۔ اس میں اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے لئے کون کونسے خطرات پوشیدہ تھے۔ قادیانی (ربوی) اور لاہوری جماعتیں کس طرح ایک ہی سکہ کے دو رُخ ہیں۔

★ نبوت کا دروازہ بند ہو جانے کے بعد، کون کونسی کھڑکیاں کھولی گئیں جن کے راستے اس قسم کے مدعیان، حصارِ اسلام میں داخل ہوگئے۔ ان کھڑکیوں کے بند کر دینے کا کیا طریق ہے۔

★ اس کتاب میں، ان تمام نکات پر، قرآن مجید اور مرزائی لٹریچر کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ اسلوب نہایت سنجیدہ، عالمانہ، محققانہ۔ اس موضوع پر اپنے انداز کی اولین تصنیف۔

★ اعلیٰ درجہ کا ولایتی کاغذ۔ کور دیدہ زیب۔ تین سو سے زاید صفحات۔

قیمت:- فی جلد بارہ روپے ۱۲/-

★ فرمائش جلد بھیج دیجئے۔ پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو جائے گا۔ (محصولڈاک پیکنگ۔ ایک روپیہ پچیس پیسے)

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام: ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور